کنہیالال کپور

میری لائبریری

نرم، گرم

تبسم، مسکراہٹ، قہقہہ اور تفنن کا خوبصورت امتزاج

پہلی مرتبہ میری لائبریری ہی میں
ڈیڑھ روپیہ

ہمارے ہاں طنزیہ و مزاحیہ تحریروں کی کمی نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ صرف کنہیا لال کپور ہی نے ہماری معاشری، اخلاقی، سیاسی و ادبی زندگی کی کمزوریوں کو طنز و مزاح کی صورت میں بے نظیر چابکدستی اور عدیم المثال فن کاری کے ساتھ پیش کیا ہے۔

کنہیا لال کپور کا مزاح شستہ، ظرافت لطیف اور طنز گہری ہے، طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مضامین میں افسانوی اور ڈرامائی رنگ بھی بھرتا ہے۔

مشاہدے کی تیزی سے اپنے موضوع کے ہر پیچ و خم کو واضح کرتا ہے، اور ہر گام پر ایسے خوشگوار واقعاتی اور نفسیاتی پلٹے کھاتا ہے کہ ہمیں کسی مقام پر ناصحانہ یا ناقدانہ انداز کا گمان نہیں ہوتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم کسی ذہین و طرار دوست کی زبانی آسکے ذہنی سفروں کے حالات سن رہے ہوں۔

''نرم گرم'' کپور کے ان کشاں مضامین کا مجموعہ ہے جنہیں پڑھ کر آپ کے لبوں پر مسکراہٹیں پیدا ہونگی، کئی اصحاب انہیں پڑھ کر بے اختیار ہنسیں گے اور پھر اپنے ہی بارے میں سوچنا شروع کر دیں گے، کئی کھوکھلی محفلوں پر سے نقاب اٹھے گا تو وہ درہم برہم ہو جائینگی، ان مضامین میں شگفتگی ہے، زندگی ہے، گہما گہمی ہے، وہ گہما گہمی جسے کپور نے تمام ادبی حلقوں میں پیدا کیا، وہ ادبی حلقے جو کپور کو اردو کا سب سے بڑا طنّاز تسلیم کرتے ہیں۔

''نرم گرم'' میری لائبریری میں کپور کا پانچواں مجموعہ ہے، دوسرے دو مجموعے ''بال و پر'' اور ''نوک نشتر'' کے علاوہ کپور کے جملہ مضامین میں سے ایک انتخاب بھی عنقریب شائع ہو جائے گا اور یہ سب مصنف کی باقاعدہ اجازت سے چھپ رہے ہیں۔ (ناشر)

نرم گرم

پشاور

۱۲ دسمبر ۱۹۶۳

اردو میں سستی اور معیاری کتابوں کا پہلا مقبول اور کامیاب ترین سلسلہ

میری لائبریری

(۴۹)

میری لائبریری میں توانائی اور زندگی بخش لٹریچر کی دوسری کتابیں

شفیق الرحمٰن :-
۱۔ لہریں
۲۔ حماقتیں
۳۔ پرواز
۴۔ مزید حماقتیں

کنھیا لال کپور :-
۱۔ سنگ و خشت
۲۔ بال و پر
۳۔ نوکِ نشتر
۴۔ شیشہ و تیشہ
۵۔ چنگ و رباب
۶۔ گردِ کارواں

مشتاق احمد یوسفی :- چراغ تلے

اے۔ ڈی اظہر (نظم) لذتِ آوارگی

اشفاق احمد (لطیفے) گرما گرم

شوکت محمود (کارٹون) ڈھول کا پول

ڈاکٹر وحید قریشی (مرتب) اردو کا بہترین انشائی ادب

اردو کا بہترین مذاحیہ ادب

اردو کا بہترین سوانحی ادب

احمد جمال پاشا اندیشۂ شہر

کنہیّا لال کپور

نرم گرم

مکتبہ میری لائبریری
ناشر و تاجر
بلبنا رچوک انارکلی لاہور

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ
جنوری ۱۹۶۳ء

ناشر بشیر احمد چودھری
ڈائریکٹر میری لائبریری، لاہور

طابع نقوش پریس، لاہور

اُردو زبان کے نام

جو مظلوم ہونے کے باوجود بڑی ظالم ہے

میری لائبریری میں پہلی مرتبہ
جنوری ۱۹۶۳ء

ناشر بشیر احمد چودھری
ڈائریکٹر میری لائبریری، لاہور

طابع نقوش پریس، لاہور

اُردو زبان کے نام

جو مظلوم ہونے کے باوجود بڑی ظالم ہے

ضروری :-

میری لائبریری سے پہلے اس کتاب کا ایک ایڈیشن مصنف کی اجازت کے بغیر پاکستان میں شائع ہو چکا ہے۔ مصنف کی خواہش کے مطابق اس امر کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں البتہ یہ کتاب ایک دفعہ ۱۹۵۷ء میں چھپ چکی ہے۔

بشیر احمد چودھری

فہرس

پیش لفظ

"انیس سو ستاون میں تیسری عالمگیر جنگ شروع ہو گی۔"

"وسیع پیمانے پر قحط پڑے گا۔"

"فلاں مصیبت آ کے گی"

"ستاون بڑا خطرناک سال ہے۔"

ستاون سے متعلق اس قسم کی گئی افواہیں آپ نے ضرور سنی ہوں گی۔ حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ ستاون میں کپور صاحب ایک نئی کتاب لکھیں گے اور وہ آپ کو پڑھنا پڑے گی ع

زہر دے اس پہ یہ تاکید کہ پینا ہوگا"

اب چونکہ ع "جس کا ڈر تھا وہ بات ہو کے رہی"..... خدا کا شکر بجا لائیے کہ کپور صاحب کی نئی کتاب بالکل ایسی ہی ہے جیسی ان کی کتابیں ہوا کرتی ہیں یعنی اس میں کچھ مضامین ایسے ہیں جنھیں کوئی شخص لکھنا پسند نہ کرتا۔ کچھ ایسے ہیں جنھیں ہر شخص لکھ سکتا اور چند ایسے بھی ہیں جنھیں ان کے علاوہ بہت کم اشخاص لکھ سکتے۔ بہرکیف صورت حال تشویشناک سہی خطرناک نہیں!

پانچ مجموعوں کے اوٹ پٹانگ نام رکھنے کے بعد اس بار خیال تھا کہ نئی کتاب کا نام سوچ سمجھ کر رکھیں گے۔ چنانچہ متعدد شعراء کے دواوین کی ورق گردانی کی گئی کہ

کوئی کام کی ترکیب ہاتھ لگ جائے لیکن شاعرانہ نازک خیالیوں اور موشگافیوں کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہؤا۔ "چراغ لالہ" "بزم و نازک" "نیک و بد" "بت حیلہ جو" "حسن کرشمہ ساز" "کمال نے نوازی" ــــ دا جنوں ترکیبوں پر غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ شعراء سے کسی قسم کی مدد کی توقع کرنا بیکار ہے۔ مایوس ہو کر دیوانِ میر بند کر رہے تھے کہ معاً نظر ان کے اس شعر پر پڑی ؎

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میر کوئی دبے جب بگڑ گئی

شعر پڑھ کر پھڑک اٹھے۔ میر کی بلائیں لینے کو جی چاہا کہ شعر تو خیر بہت اچھا کہہ گئے لیکن چلتے چلتے ہماری نئی کتاب کے لیے نام بھی خاصہ اچھا تجویز فرما گئے۔

اگر یہ شعر آپ کی نظر سے نہیں گذرا تو یقیناً آپ اسے پڑھ کر چونک اٹھیں گے اور آپ کی سمجھ میں یہ نکتہ بڑی آسانی سے آجائیگا کہ جب تک شعر یا مزاح میں چونکا دینے والی کیفیت نہ ہو ان کا ہونا یا نہ ہونا یکساں ہے اب یہ دوسری بات ہے کہ "نرم گرم" مضامین آپ کو چونکائیں گے یا محض دانت پیسنے پر مجبور کریں گے۔ بہر حال سینے پر پتھر رکھ کر پڑھ ڈالیے۔ زحمت تو ہو گی لیکن ع

چہ کند بے نوا ہمیں دارد!

ڈی۔ ایم۔ کالج موگا
۲۷۔ جون ۱۹۵۷ء

کنہیا لال کپور

مس چنبیلی

وہ جو شیخ سعدیؔ نے کہا ہے "ہنر بنمو بیا موز" بالکل بجا کہا ہے۔ برسوں ادبی رسائل میں مضامین لکھتے رہے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ ہم بھی ادیب ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ وہ چار ایڈیٹروں سے واقفیت ہوگئی اور ان کے تقاضوں نے ناک میں دم کر دیا۔ یا کچھ ادبی قسم کے لوگ جو ہمیں پہلے ہی سے جانتے تھے۔ اب ذرا اچھی طرح جان گئے کہ اگر کسی ایسی مجلس میں مدعو کیے گئے جہاں شہر کے شرفا، ورؤسا بھی موجود تھے اور کسی شخص نے ازراہ ہمدردی ہمارا تعارف ان سے کرایا تو ہمارا استقبال اس قسم کے کلمات سے کیا گیا۔

"مرزا ازبک!— کون ازبک! کہیں وہی تو نہیں جن کے پان بہت مشہور ہیں! اچھا کبھی چرنا منڈی سے گذرنے کا اتفاق ہوا تو ضرور ان کے پان بھی کھائیں گے۔"

"اچھا تو یہ ہیں مرزا ازبک! بخدا شکل وصورت سے بالکل ازبک ہی نظر آتے ہیں۔"

"مشہور ادیب ہیں! ہم نے تو ان کا نام پہلی بار سنا ہے۔"

آخر ایک دن جو اپنی گمنامی کا تجزیہ کیا تو معلوم ہوا کہ قصور اپنا ہی ہے ادبی رسائل میں لکھنا پرلے درجے کی حماقت تھی۔ اول تو ادبی رسائل کی اشاعت ہی کتنی ہوتی ہے اور پھر انہیں خریدتا اور پڑھتا کون ہے؟ چند شعرا اور ادبا جنھیں رسالہ مفت بھیجا جاتا ہے یا کالج کے کچھ ذہین طلبا جنھیں غزلیں اور نظمیں پڑھنے کا شوق ہوتا ہے لیکن جو ادبی مضامین سرے سے ہی نہیں پڑھتے۔ دراصل ادبی مضامین خشک بھی تو اتنے

ہوتے ہیں کہ ان کے عنوانات پڑھنے کے بعد ہی لاحول پڑھنے کو جی چاہتا ہے چنانچہ فیصلہ کیا کہ آئندہ صرف عوامی رسائل ہی میں لکھا کریں گے۔

اتفاق سے پتہ چلا کہ بمبئی کا مشہور فلمی رسالہ "قلم باز" اپنا ایکٹرس نمبر نکال رہا ہے۔ ہم نے فوراً ایک مضمون لکھا۔ عنوان تھا "مس چنبیلی سے ایک ملاقات" چند دنوں کے بعد ایڈیٹر صاحب کا خط آیا "مضمون بہت پسند آیا۔ مبلغ پچاس روپے کا چیک بطور معاوضہ بھجوا رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی "قلم باز" کی سرپرستی فرماتے رہیں گے۔ ہاں اپنی فوٹو بھی ضرور عنایت کیجئے گا"

چیک کو دیکھ کر باچھیں کھل گئیں۔ اور بے اختیار منہ سے نکلا "واللہ ہم بھی کتنے سادہ لوح تھے کہ ادبی رسائل میں لکھتے رہے اگر شروع سے ہی 'قلم باز' میں لکھتے تو آج خاصے مالدار ہوتے۔ ادبی مضامین کا اس فلمی مضمون سے موازنہ کیا تو پتہ چلا کہ جہاں ایک ادبی مضمون کے لئے گھنٹوں مغزپچی کرنا پڑتی ہے۔ وہاں ایک فلمی مضمون منٹوں میں لکھا جا سکتا ہے —— "مس چنبیلی سے ایک ملاقات" کو ہی لیجئے۔ لکھا ہی کیا تھا ہم نے اس میں . . . یہی کہ . . . "لمبا قد، چھریرا بدن، خوبصورت ناک نقشہ، مس چنبیلی واقعی مس چنبیلی ہے . . . . وہ ایک نہایت پُراسرار ایکٹرس ہے۔ اسے کالی بلیوں اور بھورے رنگ کے خرگوشوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ اپنی جلد کی خوبصورتی برقرار رکھنے کے لئے دیسی صابن کا استعمال کرتی ہے۔ اس کے دانت موتیوں کی طرح سفید ہیں۔ کیونکہ وہ ایک تیز چاقو سے انہیں ہر وقت کھرچتی رہتی ہے۔ اسے عطرِ حنا بالکل پسند نہیں۔ ایک دفعہ اس نے غلطی سے عطرِ حنا سونگھ لیا تھا اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے پتہ چلا کہ وہ عطرِ حنا نہیں تھا کلوروفارم تھا۔

مس چنبیلی عموماً شام کا کھانا صبح اور صبح کا کھانا شام کے وقت کھاتی ہے۔ آلو، ٹماٹر، گوبھی اور بینگن کے علاوہ اسے کوئی ترکاری پسند نہیں۔ اسے ہوائی جہاز چلانا بالکل نہیں آتا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ اس شخص سے شادی کرے گی جو بہت اچھا ہوا باز ہو۔ کھوٹے سکے، خالی بوتلیں اور مٹی کے لوٹے اکٹھا کرنے کا اُسے بے حد شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اس مضمون کا چھپنا تھا کہ سارے شہر میں تہلکہ سا مچ گیا۔ جسے دیکھو "فلم باز" کا ایکٹرس نمبر ہاتھ میں لئے مبارک باد دینے چلا آ رہا ہے۔" واہ اُزبک صاحب واہ خوب مضمون لکھا ہے۔ واللہ لطف آ گیا۔ کیا انکشاف فرماتے ہیں۔ سبحان اللہ مضمون کیا لکھا ہے قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔"

اُنہی دنوں کی بات ہے کہ ایک شام ہم پان کھانے کے لئے کنھا مل چونا مل کی دکان پر رُکے۔ ہم نے دیکھا کہ دونوں بنیا اڑی ہمیں دیکھ کر آپس میں کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ ایک آدھ منٹ کے بعد کنھا مل نے ذرا اونچی آواز میں کہا:

"تو تم ہی پوچھ لو نا۔ شرماتے کیوں ہو؟"

ہم نے پوچھا: "کیا بات ہے بھئی؟"

چونا مل نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "جی ایک بات پوچھنا تھی۔"

"کہیے۔"

"آپ مرزا اُچبک ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ میں مرزا اُزبک ہوں۔"

"ہی ہی ہی۔ آپ کی فوٹو فلم باج پتر میں دیکھی تھی۔ وہ مجمون (مضمون)... چنبیلی پر

"... آپ نے لکھا تھا۔"

"ہاں صاحب۔ ہم نے لکھا تھا۔"

"ہی ہی ہی۔ بہت اچھا مضمون ہے۔ ہم نے اسے پڑھا تھا۔ چنبیلی بہت اچھا کام کرتی ہے۔ ہم نے اپنی دوکان میں چنبیلی ہی کی تصویریں لگا رکھی ہیں۔"

ہم نے دیکھا کہ اس کی دوکان میں واقعی چنبیلی ہی چنبیلی نظر آتی ہے۔ پیسے دینے کے لئے بٹوا نکالا ہی تھا کہ کھتال نے ہمیں منع کرتے ہوئے کہا۔

"نا صاحب نا۔ ایسا نہ کیجئے۔ ہم آپ سے پیسے نہیں لے سکتے۔"

"لیکن کیوں؟" ہم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اجی رہنے دیجئے۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مس چنبیلی کو جانتے ہیں۔ آپ سے بھلا کیسے..."
بہت اصرار کیا۔ لیکن وہ نہ مانا بلکہ کہنے لگا۔ "آئندہ بھی جب کبھی پان کا شوق فرمانا ہو ہمیں یاد فرمایئے گا۔"

پان چباتے ہوئے سڑک پر جا رہے تھے کہ اچانک ایک حوالدار نے ہمیں پکار کر کہا۔

"اجی اُو نک صاحب ذرا ٹھیریئے تو۔"

حوالدار کو دیکھ کر ہمارا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ خدا خیر کرے۔ کہیں اس کے پاس ہماری گرفتاری کا وارنٹ تو نہیں ہے۔ کہیں اسے ہم پر جیل سے بھاگے ہوئے کسی مجرم کا شبہ تو نہیں ہوا۔

حوالدار صاحب نے کہا۔ "میں پرسوں سے آپ کو تلاش کر رہا ہوں۔ اچھا ہوا آپ اتفاقاً مل گئے۔"

"لیکن حوالدار صاحب ہم نے... ہمارا مطلب ہے... کہ..."

"اجی ازبک صاحب" حوالدار صاحب نے ہماری بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے کہا: "آپ نے تو کمال کر دیا۔ وہ مضمون جو آپ نے لکھا ہے چنبیلی پر، بخدا چار دفعہ پڑھ چکا ہوں اور اتنی ہی بار اور پڑھنے کا ارادہ ہے۔"

مضمون کا ذکر سُن کر جان میں جان آئی۔ وہ فرمانے لگے۔ "آئیے نا، ذرا غریب خانے تک چائے پئیں گے! ور ساتھ ہی آپ سے مس چنبیلی کے بارے میں کچھ اور تفاصیل سنیں گے۔"

میرے انکار کے باوجود وہ مجھے اپنے ہاں لے گئے۔ چائے پینے کے دوران میں پوچھنے لگے۔ "ازبک صاحب یہ جو آپ نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ایک بار مس چنبیلی نے ایک چور پکڑا تھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"جی ہاں۔ بالکل درست۔"

"لیکن وہ چور کون تھا؟"

"چور کہاں تھا قبلہ۔ وہ تو ایک فاقہ زدہ شاعر تھا۔"

"فاقہ زدہ شاعر؟"

"جی ہاں۔ بے چارا گھر سے بمبئی آیا تھا کہ فلموں کے گانے لکھے گا لیکن آپ جانتے ہیں کہ بمبئی میں واقفیت کے بغیر کام کہاں ملتا ہے۔ وہ ایک مہینے سٹوڈیوز کی خاک چھانتا رہا۔ اس اثنا میں جو پونجی گھر سے لایا تھا ختم ہو گئی۔ آخر ایک دن اس نے چوری کرنے کی ٹھانی — ایک کُند سی تلوار لے کر رات کے ایک بجے مس چنبیلی کے کمرے میں داخل ہوا۔"

"پھر —؟"

اچانک مس چنبیلی کی آنکھ کھل گئی۔ وہ شب خوابی کے لباس میں اٹھ کھڑی ہوئی اور شاعر

کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگی۔ "آپ مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں شوق سے کیجئے ع

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

دراصل یہ ایک فلم کا ڈائیلاگ تھا جو مس چنبیلی کو بروقت یاد آگیا بس صاحب شاعر نے جب یہ ڈائیلاگ سنا تو عش عش کرنے لگا۔ تلوار اس کے ہاتھوں سے گر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکلا ؎

اِس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

مس چنبیلی نے کمال صفائی سے وہ کند تلوار اٹھائی اور شاعر پہ وار کیا۔ بھوک سے تو وہ پہلے ہی نڈھال ہو رہا تھا۔ فوراً زمین پر آ رہا۔ مس چنبیلی نے گھنٹی بجائی اور اس کے پٹھان ملازم نے شاعر کی مشکیں کس دیں اور صبح اُسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔"

"خوب۔ خوب۔ کمال کی دلیری دکھائی مس چنبیلی نے۔"

"جی ہاں۔"

"اچھا آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک دفعہ مس چنبیلی نے چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دی تھی وہ کیا قصہ تھا؟"

"صاحب یہ قصہ ذرا طویل ہے پھر کبھی عرض کروں گا۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔"

رات کے وقت جب گھر لوٹے تو ہمارے ہمسائے ڈاکٹر منوہر لال صاحب تشریف لائے۔ چھوٹتے ہی کہنے لگے۔ "قبلہ ازبک صاحب آپ تو چھپے رستم نکلے یہ آپ نے لکھنا کب سے شروع کر دیا۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ آپ محض معلم ہیں۔ لیکن آپ تو اچھے خاصے ادیب بھی ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ ادیب تو کیا ہوں۔ یونہی مشغلے کے طور پر کبھی کبھار لکھا کرتا ہوں اچھا ازبک صاحب یہ جو آپ نے لکھا ہے کہ مس چنبیلی صبح کا کھانا شام کو اور شام کا کھانا صبح کھاتی ہے۔ اس سے مس چنبیلی کو بدہضمی کی شکایت تو نہیں ہو جاتی ہے۔"

"قبلہ یہ سب عادت پر منحصر ہے۔ عادت اور مشق پر۔ ہمارا تو خیال ہے کہ اگر کوئی شخص تھوڑی سی مشق کرے تو کچھ عرصے کے بعد اسے صبح اور شام میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائیگا۔"

"بہر حال میڈیکل نقطہ نگاہ سے . . . ."

"میڈیکل نقطہ نگاہ کو رہنے دیجئے۔ یہ فلم لائن ہے۔ اس میں سب کچھ چلتا ہے۔"

چند دنوں کے بعد ایک عطار کی دوکان پر جانے کا اتفاق ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ آداب بجالانے کے بعد کرسی پیش کی۔ اور کہنے لگے :۔

"ازبک صاحب ہمیں معلوم نہ تھا کہ آپ اتنے بڑے ادیب ہیں۔ ورنہ یہ گستاخی کبھی نہ ہوتی۔"

"کونسی گستاخی قبلہ ؟"

"پچھلے دنوں آپ شربت بنفشہ لینے آئے تھے، اور ہم نے آپ سے پیسے لے لئے تھے۔"

"اس میں تو کوئی گستاخی نہیں۔ آخر پیسے تو آپ . . . ."

"نہیں صاحب یہ بہت بڑی گستاخی ہے۔ خیر اس کی تلافی آج کر دی جائے گی۔ شربت بنفشہ ہی چاہئے نا آپ کو ؟"

"جی ہاں۔ چار تولے دے دیجئے۔"

"تولوں کا حساب چھوڑئیے ازبک صاحب آپ بوتل ہی لے لیجئے . . . ."

ارے بھئی خیراتی لال، ان کے صاحب کو شربت بنفشہ درجہ خاص کی ایک بوتل لا دو ——"

"لیکن قبلہ مجھے بوتل نہیں چاہیئے۔"

"اجی صاحب ہماری طرف سے ناچیز تحفہ سمجھ کر لے جائیے۔ واہ واہ کیا مضمون لکھا ہے آپ نے۔"

بوتل پیش کرنے کے بعد انھوں نے بتایا کہ مس چنبیلی کے غائبانہ مداح ہیں۔ "قلم باز" کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور صرف یہی ایک رسالہ ہے جسے ان کی دکان پر پڑیا باندھنے کے کام میں نہیں لایا جاتا۔

ان کا شکریہ ادا کر کے گھر پہونچا تو چند قلم زدہ لڑکیاں وارد ہوئیں، بیچاری بے حد پریشان تھیں۔ اور میری رہنمائی چاہتی تھیں۔ ان میں سے ایک یہ دریافت کرنے آئی تھی کہ اگر میں ایک کالی بلی مس چنبیلی کو بھجوا دوں تو کیا وہ اسے قبول کر لے گی؟ —— دوسری کے پاس کھوٹے سکوں کا ذخیرہ تھا، وہ اسے مس چنبیلی کی نذر کرنا چاہتی تھی —— تیسری یہ جاننے کی خواہش مند تھی کہ مس چنبیلی کونسا دیسی صابن استعمال کرتی ہے؟ —— ان سب کو مناسب مشورے دیئے گئے اور وہ خوش و خرم رخصت ہوئیں۔

اس دن ایک مشہور ادبی رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا خط ملا کہ وہ فانی بدایونی پر ایک نمبر نکال رہے ہیں۔ اس لئے ہم انھیں ایک مضمون بعنوان "فانی کی شاعری پر شوپن ہار کا اثر" لکھ کر بواپسی ڈاک بھجوائیں۔ ہم نے انھیں جواب میں جو خط لکھا وہ سننے کے قابل ہے۔

محترمی ـــــ غالباً آپ کو معلوم نہیں کہ ادبی مضامین سے مدت سے تائب ہو چکا ہوں۔ میرے خیال میں یہ سراسر تضیع اوقات ہے۔ نیز مالی لحاظ سے سخت خسارے کا سودا ہے۔ اگر میں آپ کے رسالے کے لئے مضمون لکھوں گا تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کریں گے کہ مجھے رسالہ بھجوا دیں گے یا یہ سمجھتے ہوئے کہ اگر مجھے اپنا مضمون پڑھنے کا شوق ہوا تو میں خود ہی خرید لوں گا رسالہ بھی نہیں بھجوائیں گے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں صرف فلمی مضامین لکھا کروں گا۔ پچاس روپے معاوضہ ملتا ہے۔ کھانے کو پان اور پینے کو شربت بنفشہ مفت مل جاتا ہے۔ نیز ہمسائے سمجھتے ہیں کہ ہم واقعی بہت بڑے ادیب ہیں۔ صاف گوئی کے لئے معذرت چاہتا ہوں۔ اگر مناسب سمجھیں تو میری طرف سے اپنے رسالے میں یہ اعلان شائع فرما دیں کہ آئندہ کوئی ادبی رسالہ مجھ سے ادبی مضمون کا تقاضا نہ کرے۔ فقط۔

میں ریڈیو کے لئے کس طرح لکھتا ہوں

میں ریڈیو کے لئے کس طرح لکھتا ہوں ؟ اس سوال کا صاف اور سیدھا جواب تو یہ ہے کہ جس طرح آپ لکھتے ہیں لیکن ممکن ہے کہ آپ ریڈیو کے لئے نہ لکھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ہی بتانا پڑے گا۔ تو لیجئے۔ میں ریڈیو کے لئے بالکل اسی طرح ہی لکھتا ہوں جس طرح مجھے ریڈیو والے لکھنے کے لئے کہتے ہیں۔ نکتہ اس انکشاف میں یہ ہے کہ جب تک ریڈیو والے آپ سے لکھنے کے لئے نہ کہیں آپ ریڈیو کے لئے لکھ ہی نہیں سکتے۔ اگر آپ ترقی پسند ادیب ہیں چین یا روس کی سیاحت کر چکے ہیں یا چینی اور روسی سفارت خانے میں ملازم ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ ریڈیو کے لئے کبھی نہیں لکھ سکتے۔ یعنی آپ کی ادبی حیثیت ریڈیو والوں کی نگاہ میں صفر تسلیم کی جائے گی۔ ہاں اگر اس قسم کی غزلیں کہتے ہیں جن میں بت کم سن اور رقیب رُو سیاہ کا ذکر رہتا ہے۔ یا ایسے افسانے لکھتے ہیں جو محبت کی واردات سے شروع ہو کر خودکشی کی واردات پر ختم ہوتے ہیں تو بلاشبہ آپ سے ریڈیو کے لئے لکھنے کی درخواست کی جائے گی۔

ایک اور بات جو یاد رکھنے کے قابل ہے یہ ہے کہ ریڈیو اسٹیشن تک آپ کی رسائی اسی حالت میں ہو سکتی ہے جب آپ ریڈیو اسٹیشن کے افسروں سے رسم و راہ پیدا کر لیں یہ کوئی اتنی مشکل بات نہیں۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ اپنے احباب کو ریڈیو کے محکمے میں ملازمت کرنے پر آمادہ کریں۔ اگر آپ کا ایک دوست بھی اس محکمے میں ملازم ہو گیا

تو جب تک اس کی ملازمت سلامت ہے آپ ریڈیو کے لئے لکھتے رہیں گے۔ بالفرض آپ کا کوئی دوست ریڈیو کی ملازمت کرنے پر رضامند نہیں ہوتا تو پھر بہرحال آپ کو ان لوگوں کی خدمت میں باریابی حاصل کرنا ہوگی جو ریڈیو اسٹیشن پر خدا یا ناخدا کی حیثیت سے قابض ہیں یعنی ڈائرکٹر، اسسٹنٹ ڈائرکٹر، پروگرام ایگزیکٹیو وغیرہ۔ ڈائرکٹر سے ملاقات کرنا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے کیونکہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان عموماً ملاقاتیوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ اس کے پاس ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے۔ حالانکہ دیکھا جائے تو دو چار ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ اسسٹنٹ ڈائرکٹر عموماً دین و دنیا سے اس قدر بیزار رہتا ہے کہ اس سے ملاقات کرنے کے بعد ملاقاتی کچھ لکھنے کی بجائے خودکشی کرنا زیادہ مناسب سمجھتا ہے۔ اس لئے اگر آپ پروگرام ایگزیکٹیو سے ملنے کی کوشش کریں تو بہتر ہوگا۔ پہلے ٹیلیفون پر اس سے ملاقات کا مناسب دن اور وقت دریافت کریں اور پھر دو چار انگریزی یا فرانسیسی ناول بغل میں داب کر اس کے دفتر میں جا دھمکیں۔ گفتگو اس قسم کی ہونی چاہیئے۔

"آداب عرض ہے۔"

"مدت سے خواہش تھی کہ آپ سے شرفِ نیاز حاصل کیا جائے۔"

"آپ تو اردو، ہندی، بنگالی اور گجراتی کے مانے ہوئے ادیب ہیں۔"

"وہ ناول جو آپ پچھلے پندرہ برس سے لکھ رہے تھے، اس کا پہلا باب آپ نے لکھ لیا یا ابھی اس کا پلان بنا رہے ہیں۔"

"جب سے آپ یہاں تشریف لائے ہیں پروگرام یقیناً بہتر ہو گئے ہیں۔ اب تو کبھی کبھی تقریریں سننے کو بھی جی چاہنے لگا ہے۔"

"یہ الماس بیگم تو آپ کی دریافت معلوم ہوتی ہیں۔ آپ کے آنے سے پہلے اسے کوئی منہ نہیں لگاتا تھا۔"

"آپ نے یہ فرانسیسی ناول پڑھا۔ اگر آپ اسے گجراتی میں منتقل کریں تو کیسا رہے گا۔"

ان باتوں کے جواب میں اگر پروگرام اگزیکٹیو سمجھدار ہے تو ذرا سا مسکراتا رہے گا۔ اگر نہیں ہے تو شیخی بگھارنے لگے گا۔ آپ اس کی باتوں سے ذرہ بھر بھی مرعوب نہ ہوتے ہوئے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے جائیے۔ اگر وہ کہے کہ فرصت بھی کتنی ملتی ہے کہ کوئی اپنے ناول کا پہلا باب مکمل کر سکے۔ تو آپ کو فوراً کہنا چاہئیے "بجا ارشاد ہوا۔ یقیناً اگر آپ کسی ادر محکمے میں ہوتے تو اس وقت تک دو درجن ناولوں کے مصنف ہوتے"۔ اگر وہ کسی جرمن یا جاپانی مصنف کا حوالہ دے جس کا تازہ ناول وہ پڑھ رہا ہے تو آپ دس بارہ فرضی ڈچ یا چینی مصنفوں کے نام گنوا دیجئے جن کے تمام ناول آپ پڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اس ملاقات کا آپ کو یہ فائدہ ہو گا کہ آئندہ آپ پروگرام اگزیکٹیو کی نگاہ میں رہیں گے اور جب دنیا سلسلہ (series) شروع کریگا۔ ایک آدھ تقریر آپ کو مل جائے گی۔

دوسری بات جو آپ کو اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیے یہ ہے کہ ریڈیو والے ہمیشہ تقاریر کے "سلسلے" تجویز کرتے ہیں مثلاً سلسلہ ہو گا "کیسے چلتی ہے"۔ اور اس میں تقاریر کے عنوانات ہوں گے:

۱۔ کھوٹی اٹھنی۔

۲۔ زنگ خوردہ بندوق۔

۳۔ بات سے بات۔

۴۔ پنڈت جی کی بہلی۔

۵۔ بد مزاج بیوی کی زبان۔

اب آپ اِس پر نہ جایئے کہ "یہ سلسلہ" کتنا مضحکہ خیز ہے یا اس میں تقاریر کے عنوانات کتنے عجیب و غریب ہیں بلکہ ؎ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست کے مصداق اسے نظر انداز کر دیجئے۔ اور چپکے سے تقریر لکھ ڈالیے۔ اس ضمن میں ایک انکشاف آپ کی مدد کر سکتا ہے وہ یہ کہ قریب قریب ہر ریڈیو سٹیشن ایک ہی قسم کے سلسلے نشر کرتا ہے۔ اس لئے آپ غور سے ہر سٹیشن کا پروگرام سنیئے۔ کوئی نہ کوئی وہی تقریر نشر کر رہا ہو گا کہ جو آپ کو کرنا ہے اس لئے آپ وہ ساری کی ساری تقریر نوٹ کر لیجئے۔ اور پھر تاریخ مقررہ پر نشر فرما دیجئے۔

بعض اوقات تقاریر کے نئے سلسلے پر کسی مشہور شاعر کا کوئی چلتا ہوا مصرع چسپاں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ؎ یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ

۱۔ ہم خاکروب ہوتے!

۲۔ ہم حجّام ہوتے!

۳۔ ہم تھانیدار ہوتے!

۴۔ ہم سمجھدار ہوتے!

یا ؎ تنگدستی اگر نہ ہو غالبؔ

۱۔ بے حیائی ہزار نعمت ہے!

۲۔ روسیاہی ہزار نعمت ہے!

۳۔ بددماغی ہزار نعمت ہے!

جب صورتِ حال یہ ہو تو آپ غالبؔ کی روح سے معذرت کئے بغیر تقریر کا آغاز کر دیں۔ کیونکہ اگر آپ یہ سوچنے لگے کہ غالبؔ مرحوم پر جنت میں کیا گذرے گی تو آپ تقریر نہیں کر سکیں گے۔

تقاریر کے علاوہ ریڈیو والے آپ سے فیچر اور ڈرامے بھی لکھواتے ہیں۔ فیچر ریڈیو کی خاص ایجاد ہے۔ اس کو عام طور پر وہ لوگ لکھتے ہیں جو فیچر سے بہتر چیز لکھنے کے اہل نہیں۔ چونکہ معاوضہ کافی ملتا ہے اس لئے فیچر نویس ہرگز خسارے کا سودا نہیں۔ فیچر موسموں، کھٹملوں اور گھڑیوں پر لکھے جاتے ہیں۔ کسی خاص موسم پر فیچر لکھنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ اس موسم سے متعلق جتنے گیت، نظمیں یا غزلیں ملیں۔ انھیں اکٹھا کر لیجئے اور پھر پانچ دس سطور خود لکھئے اور ایک آدھ سطر کے بعد دو تین بلکہ چار گیت نقل کرتے جائیے۔ مثلاً آپ کو "بسنت" پر لکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ آپ کو مندرجہ ذیل طبعزاد فقرے لکھنا ہوں گے۔

"بسنت! آہاہا! بسنت! یعنی واہ واہ بسنت کا موسم ہے۔ جدھر دیکھیو ادھر بسنت۔ دائیں بائیں آگے پیچھے بسنت! ساتویں آسمان کے علاوہ ہر جگہ بسنت۔ ریڈیو سٹیشن پر بہار ہی بہار نظر آتی ہے۔ ڈائرکٹر صاحب کو شاید یرقان ہو گیا ہے اسی لئے انھیں ہر چیز پیلی پیلی نظر آرہی ہے۔ وہ دیکھئے۔ ارے وہ بسنتی کپڑوں میں ملبوس خوبصورت لڑکیاں بسنت کے گیت گا رہی ہیں۔ اور ادھر بدصورت لڑکے اُن کا منھ چڑا رہے ہیں۔ آئیے یہاں سے کہیں دُور بھاگ چلیں۔ ورنہ ہمیں یہ گیت سننا پڑیں گے!"

اگر آپ کو کسی شہر پر فیچر لکھنا مقصود ہے تو یوں لکھئے۔

"دلّی! ہندوستان کا دل ہے۔ ہندوستان ایشیا کا دل ہے۔ اور ایشیا خدا جانے کس کا دل ہے۔ بہرحال کسی کا ہوگا۔ دلی کئی بار اجڑی اور کئی بار بسی اور اب اجڑنے کا نام نہیں لیتی۔ دلّی بہرحال دلّی ہے یعنی لکھنؤ یا ٹمبکٹو نہیں۔ دلّی میں بڑے بڑے باکمال لوگ رہتے ہیں۔ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ سبھی باکمال۔ دلّی کی گلیوں میں خاص کشش ہے کیونکہ یہاں بارہ مسالے کی چاٹ بکتی ہے۔ اسی لئے تو انھیں چھوڑ کر جانے کو جی

نہیں چاہتا۔ جائے بھی تو کوئی کہاں جائے۔ چاروں طرف دلّی ہی دلّی ہے۔ یہاں کا ہر فاقہ مست اپنے کو میر یا غالب سمجھتا ہے۔ اللہ اللہ خود فریبی کی بھی حد ہوتی ہے۔ دلّی شہر نہیں۔ بھول بھلیاں ہے۔ نئی دلّی میں راستہ بھول جاؤ تو پرانی دلّی میں جا پہنچو۔ اور پرانی دلّی میں راستے سے بھٹک جاؤ تو نئی دلّی پہنچ جاؤ۔ دلّی کی اہمیت تبھی تک ہے جب تک مہا دہلی وجود میں نہیں آتا وغیرہ وغیرہ۔"

اب رہے ریڈیو ڈرامے! ریڈیو ڈرامہ لکھنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے کہ کبھی طبعزاد ڈرامہ لکھنے کی غلطی نہ کی جائے۔ اوّل تو پلاٹ ہی مشکل سے ملتا ہے۔ پلاٹ مل جائے تو مناسب کلائمیکس نہیں سوجھتا۔ کلائمیکس بھی سوجھ جائے تو اختتام کا مسئلہ اچھی خاصی الجھن پیدا کر دیتا ہے۔ ان مشکلوں سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ کسی انگریزی انتخاب کی طرف رجوع کیجئے جس کا نام ہو "۱۹۵۵ء کے بہترین ناٹک" یا "انیسویں صدی کے مشہور ایک ایکٹ کے ڈرامے۔"

اس کتاب سے پلاٹ۔ کردار۔ زبان اڑا کر انھیں ہندوستانیت کا رنگ دیجئے۔ اگر اصل ڈرامے کا نام ہے "کھٹے انگور" تو اب اس کا نام رکھ دیجئے "میٹھا آلو بخارا" لیجئے ڈرامہ تیار ہے۔ معمولی ترمیمیں تو ہوں گی ہی۔ مثلاً ہیرو کا نام "ولیم" کی بجائے "دلی علیم" ہو گا اور ہیروئن ڈلی کی بجائے لیلیٰ کے نام سے پکاری جائے گی۔ اگر آپ ایسا ڈرامہ لکھ دیں گے تو نہ صرف ریڈیو والے آپ کی ذہانت کی داد دیں گے بلکہ مبلغ تیس روپے کا چیک بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے۔

ایک آخری بات اور یاد رکھئے۔ جب کبھی آپ ریڈیو پر تقریر کریں یا آپ کا لکھا ہوا کوئی فیچر یا ڈرامہ نشر کیا جائے اس سے اگلے دن آپ اپنے احباب

کو لکھیں کہ وہ آپ کی تقریر، ڈرامے یا فیچر کے بارے میں تعریفی خطوط ریڈیو سٹیشن ڈائرکٹر کے نام بھجوائیں۔ اگر ہو سکے تو چھ سات خطوط آپ خود لکھ کر فرضی ناموں کے تحت ڈائرکٹر صاحب کو بھجوا دیں۔ مضمون یہ ہونا چاہئیے۔

محترمی!

بڑی مدت کے بعد آپ کے سٹیشن سے ایک اچھا فیچر سننے کو ملا۔ میری مراد ہے میر معلوم ہے قلندر رہتا نسے سے ہے۔ ملنگ شمسانوی صاحب نے میر کی قلندری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے وہ بعینہٖ میر کے اپنے الفاظ ہی ہیں۔ امید ہے آپ یہی فیچر دوبارہ بلکہ سہ بارہ سنوائیں گے۔ ہاں اگر مناسب سمجھیں تو ملنگ صاحب سے کہیں کہ ایک فیچر ست پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ پر آپ کو لکھ کر دیں۔

تو لیجئے۔ یہ ہے۔ ریڈیو کے لئے لکھنے کی تکنیک۔ اللہ توفیق دے تو آپ بھی ریڈیو کے لئے لکھا کیجئے۔ دلچسپ شغل ہے اور پھر جیسا کہ ملنگ صاحب نے کہا ہے۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام!

کہ پہچانی ہوئی صورت بھی .....

اک زمانہ تھا کہ احباب ہمارے متعلق کہا کرتے تھے "غضب کا حافظہ پایا ہے آپ نے! برسوں کی بات آپ کو اس طرح یاد رہتی ہے جیسے وہ کل کی یا زیادہ سے زیادہ پرسوں کی بات ہو!" غیر تو غیر خود ہمیں اپنے حافظے پر رشک آیا کرتا تھا اور اب کہ عمر بچپن سے تجاوز کر چکی ہے، یہ حال ہے کہ بسا اوقات دوپہر کے وقت سوچنا پڑتا ہے کہ صبح کا ناشتہ کر لیا ہے یا ابھی کرنا ہے۔ سگرٹ جو سلگانے کے لئے نکالا تھا منہ میں رکھ لیا ہے پھر سگریٹ کیس ہی میں رکھ دیا ہے۔ جس درزی سے قمیص کا مطالبہ کر رہے ہیں وہی ہے جسے کپڑا لا کر دیا تھا یا اس سے ملتا جلتا کوئی دوسرا ہے۔ خیر یہ معمولی پریشانیاں ہیں انہیں اٹھایا جا سکتا ہے لیکن اس کا اب کیا کیا جائے کہ آئے دن کوئی شناسا صورت سوالیہ نشان بن کر سامنے کھڑی ہو جاتی ہے اور پوچھتی ہے "مجھے پہچانا؟" اس وقت یہ حال ہوتا ہے کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ لاکھ حافظے کو کریدتے ہیں کہ ان حضرت سے کہاں ملاقات ہوئی تھی۔ بمبئی میں؟ کلکتے میں؟ شاید دہلی میں؟ لیکن ان شہروں میں تو سینکڑوں آدمیوں سے ملے تھے۔ تو پھر یہ کون ہو سکتے ہیں۔ اچھا تو یہ وہ ہیں جن سے ایک بار راہ چلتے کلکتہ یونیورسٹی کا راستہ دریافت کیا تھا۔ لیکن یہ بنگالی تو معلوم نہیں ہوتے۔ تو پھر وہی ہوں گے جنہیں ایک بار کسی مشاعرے میں سنا تھا یا شاید؟ اُف کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے جھوٹ موٹ کہہ دیتے ہیں "ہاں صاحب! کیوں نہیں پہچانا۔ بھلا آپ کو کیسے بھول سکتے

ہیں ؟" اکھڑا اکھڑا لہجہ صاف بتا رہا ہے کہ ہم حکمتِ عملی سے کام لے رہے ہیں! آخر وہ دار
بھی اتنا کم سمجھ نہیں کہ ہماری گھبراہٹ کو بھانپ نہ جائے۔ اس لیئے وہ فوراً پوچھتا ہے
"بھلا بتایئے تو ہم کون ہیں ؟" اب اس سوال کا کیا جواب دیا جائے۔ یعنی ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

اگر یہ جانتے کہ آپ کون ہیں تو مصافحہ کرتے وقت ہی نہ بتلا دیتے۔ ایک بار پھر ان
کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد ہم کہتے ہیں "اگر ہم غلطی نہیں کر رہے تو آپ
ہمارے استاد مولوی رمضان علی ہیں۔ ہم آپ سے آٹھویں جماعت میں فارسی پڑھا کرتے تھے۔

"ہا ہا ہا۔ مولوی رمضان علی۔ خوب پہچانا آپ نے۔ اجی حضرت میں تو آپ کا شاگرد قربان علی
ہوں۔ میں آپ سے دسویں جماعت میں انگریزی پڑھا کرتا تھا۔"

"آہا۔ قربان علی۔ ہاں بھئی تم واقعی قربان علی ہو لیکن اس وقت تمھاری ڈاڑھی نہیں
ہوا کرتی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"جناب اس وقت عمر ہی کیا تھی جو ڈاڑھی ہوتی۔ اس وقت تو میں بچہ تھا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن اب تو آپ خاصے بزرگ نظر آتے ہیں۔ شاید ڈاڑھی کی بدولت۔"

"اس ڈاڑھی کا بھی عجیب قصہ ہے صاحب! ایک بار میرا سیفٹی ریزر گم ہو گیا دوسرا خریدنے
کا مقدور نہ تھا میں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ شیو نہیں کیا کروں گا۔ بس اسی دن سے جو ڈاڑھی
نے بڑھنا شروع کیا اب تک برابر بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

"تبھی تو میں بھی دل میں سوچ رہا تھا کہ ہے تو قربان علی لیکن اس کمبخت نے یہ حلیہ کیا بنا رکھا ہے۔"

"لیکن صاحب یہ رہی خوب۔ آپ کو اپنے شاگرد پر اپنے استاد کا دھوکا ہوا۔"

"نہیں نہیں دھوکا نہیں ہوا۔ دراصل اس وقت جو تمھاری وضع قطع ہے وہ بالکل مولوی رمضان علی سے ملتی ہے۔ خدا بخشے بڑی خوبیوں کے مالک تھے مولوی صاحب اس محنت اور محبت سے فارسی پڑھایا کرتے تھے کہ داد نہیں دی جا سکتی۔ اب ایسے استاد کہاں۔"

"پھر بھی آپ کا دم غنیمت ہے صاحب۔"

"اجی نہیں۔ میں کیا ہوں۔ میں تو اگر آپ کی طرح ڈاڑھی بھی رکھ لوں، تو مولوی رمضان علی کی گرد کو نہیں پہنچ سکتا ... اچھا کوئی میرے لائق خدمت؟"

"بس نیاز حاصل کرنے ہی آیا تھا۔ اب اجازت دیجیے۔"

وہ چلے جاتے ہیں اور ان کی غیر حاضری میں اپنے حافظے کا ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے۔ قربان علی کو مولوی رمضان علی سے خلط ملط کر بیٹھے اُف کتنی غلطی ہوئی۔

چند دنوں کے بعد گاڑی کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہل رہے ہیں کہ کسی نے نہایت بے تکلفانہ انداز میں ہمارا نام پکارتے ہوئے کہا۔"میں نے کہا چوپڑہ صاحب اک نظر ادھر بھی۔"

حیرانی کے عالم میں ہم ایک اجنبی سے پوچھتے ہیں۔"کیوں صاحب آپ نے ہمیں آواز دی"۔ وہ مسکرا کر جواب دیتا ہے۔"جی ہاں اگر آپ کا نام گنیش داس چوپڑہ ہے تو۔"

فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ یہ شخص ہمیں جانتا ہے لیکن ہم اسے نہیں پہچانتے۔ وہ ہماری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پھر کہتا ہے:"اگر آپ مرادآباد کے رہنے والے ہوں تو..."

یہ تو ٹھیک کہتا ہے رہنے والے تو ہم مرادآباد ہی کے ہیں۔

"اگر آپ کے چھوٹے بھائی کا نام موتی ساگر ہو تو..."

یہ بھی درست ہے۔

"اگر آپ لکھنؤ یونیورسٹی میں پڑھتے رہے ہوں تو..."

یا الٰہی! یہ شخص تو غیب کا علم جانتا ہے ابھی ابھی کہے گا: "اگر آپ کی بیوی کا نام رنجنا دیوی ہے تو۔ اگر آپ کے سات بچے ہوں تو۔ اگر آپ کی عمر ستاون سال ہو تو" لیکن یہ ہے کون۔ ہماری تو اس سے پہلی ملاقات معلوم ہوتی ہے۔ وہ ایک بار پھر مسکرا کر پوچھتا ہے ۔ "کہیئے پہچانا ہمیں؟"

"جی ہاں، پہچان لیا۔"

"تو پھر بتایئے ہم کون ہیں؟"

"آپ ہمارے خیال میں بنارس کے مشہور جیوتشی رنگ بہاری لال ہیں کہ جو جنم پتری دیکھے بغیر ماضی، حال، مستقبل کی تمام باتیں بتا دیتے ہیں۔"

"واہ! چونڑہ صاحب واہ۔ اتنی جلدی بھول گئے۔ جی ہم رنگ بہاری نہیں شام مراری ہیں ۱۹۴۰ء میں آپ سری نگر میں اپنے بھائی موتی ساگر کے ساتھ ہمارے ہوٹل میں ہی ٹھہرے تھے۔"

اتنے میں گاڑی آجاتی ہے۔ ہم شام مراری سے اجازت لیکر ایک ڈبے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اور اپنی سیٹ پر بیٹھ کر سوچتے ہیں۔ یہ شام مراری بھی عجیب قسم کے ہوٹل پروپرائٹر واقع ہوئے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں ہم ضرور ملے تھے لیکن سولہ سال کی بات ہے۔ اس پر فرماتے ہیں اتنی جلدی بھول گئے۔ اونہہ! جیسے سولہ برس کا عرصہ معمولی عرصہ ہوتا ہے۔ شام مراری کی سادہ لوحی پر دل ہی دل میں تبصرہ کرنے کے بعد جونہی ہم سامنے والی سیٹوں پر نظر دوڑاتے ہیں۔ ایک شخص ہماری طرف گھور گھور کر دیکھ رہا ہے۔ عمر میں ہم سے پانچ سال چھوٹا۔ چاند انڈے کی طرح صاف شفاف۔ آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والی عینک۔ دو ایک منٹ کے بعد وہ ہماری طرف لپک کر کہتا ہے: "میرے خیال میں آپ پروفیسر چونڑہ ہیں۔

"آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں۔"

ہم نفی میں سر ہلاتے ہیں۔

"ذرا کوشش کیجئے آپ مجھے جانتے ہیں۔"

"کچھ اتا پتا بتایئے تو کوشش کریں۔"

"کلکتے میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"کب؟"

"سات برس کی بات ہے۔"

"اچھا۔ ہاں ہاں سمجھ گئے۔ تو آپ ہیں۔ کہئے آپ کی وہ فلم مکمل ہو گئی؟"

"کون سی فلم؟"

"وہی کیا نام تھا اس کا۔ لیمپ کا جادو!"

"لیمپ کا جادو؟"

"نہیں نہیں۔ جادو کا لیمپ۔"

"جادو کا لیمپ؟ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟"

"تو کچھ اور نام ہوگا۔ بہرحال وہ مکمل ہو گئی نا؟"

"لیکن صاحب میں فلم لائن میں نہیں ہوں۔"

"فلم لائن میں نہیں ہوں؟ تو کیا آپ ڈائرکٹر گھوش نہیں ہیں؟"

"اجی کہاں ڈائرکٹر گھوش۔ کہاں ایک معمولی پوسٹ مین۔"

"معمولی پوسٹ مین؟"

"جی ہاں۔ میں اجے کمار پوسٹ مین ہوں۔ ٹالی گنج میں جہاں آپ ٹھہرے تھے۔ میں آپ کی ڈاک لایا کرتا تھا۔ پوجا کی چھٹیوں میں آپ نے مجھے انعام بھی دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔ بالکل بالکل۔ آپ اجے کمار ہیں۔ معاف کیجئے۔ مجھے مغالطہ اس لئے ہوا کہ ڈائرکٹر گھوش بھی آپ کی طرح . . . ."

"ہاں ہاں گنجے ہیں۔"

"لیکن یہ آپ یک لخت گنجے کیسے ہو گئے۔ اس وقت تو آپ کے سر پر کافی بال تھے؟"

"یہ سب نزلے کی مہربانی ہے صاحب پچھلی گرمیوں میں سارے بال جھڑ گئے۔"

"اوہو۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ ان گرمیوں میں خیال رکھئے گا۔"

"جی؟"

"کچھ نہیں۔ ویسے اور تو خیریت ہے نا۔"

"جی ہاں! جی ہاں!"

اتنے میں گاڑی ایک سٹیشن پہ رکی اجے کمار جے ہند کہہ کر رخصت ہوتے اور ہم گنجے پن کی کرامات پر غور کرنے لگے جس کی بدولت سب گنجے ایک سے نظر آتے ہیں۔ بارہا یوں بھی ہوتا ہے کہ سڑک پہ چلتے ہوئے ہم نے کسی شخص کو دیکھا اور اس کے قریب جا کر کہا "آداب عرض، کہئے آپ کب تشریف لائے؟" اس نے ہمیں بالکل نہ پہچانتے ہوئے جواب دیا "معاف کیجئے آپ کو مغالطہ ہوا۔" ہم نے فوراً کہا "اجی ہمیں بنا رہے ہیں آپ۔ ٹھیک ہے۔ بہت بڑے افسر جو ٹھہرے۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟"

"ہاں جناب اب آپ ہمارا مطلب کیوں سمجھنے لگے۔ گورنمنٹ کالج کے پرنسپل جو ہوئے۔"

"گورنمنٹ کالج کا پرنسپل۔ یہ آپ سے کس نے کہا؟"

"اجی کہنا کس نے تھا۔ اخبار میں جو چھپا تھا۔ یکم فروری سے آپ پرنسپل بنا دئے گئے ہیں۔"

"جی وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔"

"جی نہیں ہم نے خود پڑھا تھا کہ ریاض احمد پرنسپل مقرر کئے گئے ہیں۔"

"معاف کیجئے میں ریاض احمد نہیں ہوں۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیونکہ میرا نام احمد علی ہے اور میں میونسپلٹی میں کلارک ہوں۔"

"اوہ! بڑی غلطی ہوئی معذرت چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ ایسا اکثر ہو ہی جاتا ہے۔"

وہ چلا جاتا ہے اور ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں اور سوچتے ہیں وہ وقت قریب آرہا ہے جب ہر شخص پر ہمیں کسی دوسرے شخص کا دھوکہ ہوا کرے گا اور جب لوگ ہمارے دماغی توازن کے متعلق عجیب و غریب رائیں قائم کریں گے کتنی مضحکہ خیز صورت حال ہو گی جب مثال کے طور پر ہم کسی ناواقف عورت سے کہیں گے۔ "نمستے بھابی۔ کہیے مزاج کیسا ہے؟" اور وہ خشم آلود نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دے گی "شرم نہیں آتی آپ کو راہ چلتی عورتوں سے مذاق کرتے ہوئے" اور جو کسی شوخ و شنگ حسینہ سے پالا پڑ گیا تو... بچاؤ کی صرف یہی صورت ہے کہ آئندہ کسی کو پہچاننے کی کوشش ہی نہ کریں۔ ہر ملاقاتی سے مصافحہ کرنے کے بعد کہہ دیا کریں "ہم سے یہ امید مت کیجئے گا کہ ہم آپ کو پہچان لیں گے دراصل کثرت مطالعہ کی وجہ سے بینائی اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ غیر تو غیر اکثر ہم اپنے آپ کو بھی نہیں پہچان سکتے ؎

ہو گئے مضمحل قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں اعتدال کہاں

ہندوستان دیکھئے

میں ابھی ابھی ایک گاڑی سے اُترا ہوں اور تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں ایک بنچ پر بیٹھ کر دوسری گاڑی کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں ایک رشتہ دار کی شادی میں شامل ہونے کے لئے گیا تھا اور مجھے افسوس ہو رہا ہے اس لئے نہیں کہ شادی اس کی تھی اور کوفت مجھے ہوئی بلکہ اس لئے کہ ایک سترہ سالہ حسین دوشیزہ ایک بدصورت ادھیڑ عمر کے آدمی کے پلے باندھی گئی۔ مجھے اس راز کا پتہ بعد میں چلا۔ ورنہ میں ہرگز اس شادی میں شامل نہ ہوتا۔ یہ میرا رشتہ دار بریلی میں وکیل ہے تقسیم ہند کے بعد ایک خاندان نے اس کے قریب میں پناہ لی۔ وہ اس خاندان پر ڈورے ڈالنے لگا۔ اپنے رسوخ سے انہیں ایک ٹوٹا پھوٹا مکان الاٹ کرا دیا۔ اپنا بوسیدہ فرنیچر ان کے گھر بھجوا دیا۔ بڑے لڑکے کو مقامی بینک میں چپڑاسی لگوا دیا۔ پچھلے سال اس کی بیوی سرگباش ہو گئی اور اس سال اس فرشتہ سیرت وکیل نے اس شرنارتھی خاندان کی دوشیزہ سے جو الیف اسے پاس ہے دوسری شادی رچا لی۔ میں نے اس لڑکی کی ایک ہلکی سی جھلک اس وقت دیکھی تھی جب وہ ڈولی میں سوار ہو رہی تھی۔ بھرا بھرا جسم گورا چٹا رنگ اور آنکھیں! ایسی آنکھیں جنھیں ایک بار دیکھنے کے بعد پھر کوئی دوسری چیز نظروں میں نہیں جچتی۔ نہ جانے اسے دیکھ کر مجھے فرانسیسی شاعر کا مصرع کیوں یاد آ گیا۔ ع "خدا نے جب اس لڑکی کو بنایا ہو گا تو خدا جانے اس کا اپنا ایمان متزلزل ہونے سے کیسے بچا ہو گا" اور بنچ پر بیٹھا ہوا میں سوچ رہا ہوں کہ اس لڑکی کی کس کس حسرت کا خون ہوا ہو گا۔

میرے سامنے مسافر خانے کی ٹین کی دیوار پر بڑے بڑے اشتہار لگے ہوئے ہیں کسی پر کشمیر کا منظر ہے کسی پر بمبئی کا۔ کلکتے کی چورنگی کی تصویر ہے اجنتا اور ایلورا کی غاریں ہیں ان اشتہاروں کے نیچے موٹے حروف میں لکھا ہے "سی انڈیا ("ہندوستان دیکھئے")۔

میں یہ پڑھ کر دل میں کہتا ہوں "خوب۔ ہندوستان دیکھئے تو گویا ابھی تک ہم انگلستان یا فرانس دیکھتے رہے ہیں۔" ہندوستان دیکھئے! لیکن کیوں نہ اس سے پہلے ہندوستان کا محکمہ ریل دیکھئے۔ سبحان اللہ۔ کیا کیا نئی گاڑیاں ایجاد کی ہیں اس محکمے نے۔ جنتا ایکسپرس! اگر اس کا نام "جہنم ایکسپریس" رکھ دیتے تو کیا ہرج تھا۔ میں ابھی ابھی اسی گاڑی سے سفر کرکے آ رہا ہوں۔ ہر تھرڈ کلاس ڈبہ کلکتے کے روائتی "بلیک ہول" کی یاد دلاتا تھا۔ خدا جانے کلکتے میں کوئی واقعی بلیک ہول تھا۔ یا یہ کسی انگریز کے زرخیز دماغ کی اختراع تھی۔ مگر یہاں تو ایک نہیں درجنوں بلیک ہول دیکھ لیجئے۔ پچاس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ اور سوار ہیں ایک سو پچاس۔ کچھ کھڑے ہیں۔ کچھ فرش پر لیٹے ہوئے ہیں اور باقی باہر لٹک رہے ہیں۔

ہمیں تو اس کے کوچے میں کسی صورت بسر کرنا

کھڑے ہیں یا پڑے ہیں یا پسِ دیوار بیٹھے ہیں

اور پھر ہر نئے اسٹیشن پر نئے مسافروں کی یلغار نشستوں کا یہ حال کہ اگر نشست پر بیٹھنے کی کوشش کی جائے تو آسانی سے آدمی کسی دائیں بائیں بیٹھے ہوئے مسافر کی گود میں جا گرے۔ کرایہ کم تو نہ یعنی تھرڈ کلاس کا کرایہ ادا کیجئے تو محسوس ہو کہ سکینڈ کلاس کے دام لئے جا رہے ہیں اور تھرڈ کلاس میں بیٹھے، تو پتہ چلے کہ فورتھ یا ففتھ کلاس میں سفر کر رہے ہیں۔ خوب! ہندوستان دیکھئے۔ لیکن ریلوے ورکشاپ میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت مت دیکھئے کیونکہ وہ دیکھنے کے لائق ہی کب ہیں۔ اس لئے آپ مزے سے ایلورا کی سیر کیجئے۔

میرے بنچ کے قریب ایک نیم برہنہ نوجوان فرش پر لیٹا ہوا ہے۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے بعد وہ دھاڑیں مار کر روتا ہے اور ظفر کی مشہور غزل کا مقطع پرسوز لے میں دہراتا ہے

کوئی مجھ پہ شمع جلائے کیوں۔ کوئی مجھ پہ آنسو بہائے کیوں
کوئی مجھ پہ پھول چڑھائے کیوں کہ میں بے کسی کا مزار ہوں

یا الٰہی! اس شخص کو کیا ہوا ہے۔ میں وقت کاٹنے کے لیے بنچ پر اونگھتے ہوئے اپنے ساتھی سے پوچھتا ہوں۔ وہ کہتا ہے۔ کچھ معلوم نہیں عجیب و غریب روائتیں ہیں اس کے متعلق۔ کوئی کہتا ہے کہ اسے ایک برہمن لڑکی سے عشق تھا۔ وہ بھی اسے چاہتی تھی لیکن لڑکی کے ماں باپ رضامند نہ ہوئے۔ کیونکہ یہ کھتری ہے اور وہ برہمن۔ یہ بھی سنا ہے کہ اسے کسی لڑکی سے عشق نہیں تھا۔ اس نے ایک بار سائیں کو پیسہ نہیں دیا تھا۔ اس نے بددعا دی کہ تو پاگل ہو جائے گا اور کتے کی موت مرے گا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ یہ شخص بڑا ذہین ہے۔ ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا ہے۔ چار سال نوکری کے لیے مارا مارا پھرتا رہا۔ کہیں کام نہ بنا۔ فاقوں کے مارے برا حال ہو گیا اور ایک دن دماغ چل گیا۔ کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ کسی کارخانے میں مزدور تھا۔ پچھلے دنوں چھانٹی میں آگیا۔ اور متواتر بیکار رہنے کی وجہ سے دماغ خراب ہو گیا۔ کل ایک شخص کہتا تھا کہ یہ بے چارا شرنارتھی ہے۔ چار پانچ سال سرکار کے وعدوں پر جیتا رہا اور اب اس حال کو جا پہنچا ہے۔

میرا ساتھی بات ختم کر کے پھر اونگھنے لگا ہے۔ اس نوجوان نے پھر ایک دلدوز چیخ بلند کی ہے اور زور زور سے کہہ رہا ہے کہ وہ بیکسی کا مزار ہے بے کسی کا! میری نظریں پھر سامنے والے اشتہار پر جا پڑی ہیں "کشمیر دیکھئے! نشاط باغ کی سیر کیجئے"۔ آہ کشمیر! کشمیر کا نام پڑھتے ہی نہ جانے میری یہ حالت کیوں ہو جاتی ہے کہ بے اختیار فراق کا مصرع میرے

نطق پر آجاتا ہے۔ ع

اِک تیز چھُری ہے کہ اُترتی چلی جائے

دو سال ہوئے میں کشمیر گیا تھا۔ نشاط باغ بھی دیکھا لیکن افسوس مجھے ایک عام کشمیری کی زندگی نشاط سے خالی نظر آئی۔ جیسے اُسے ہمیشہ کے لئے نشاط باغ سے نکال دیا گیا ہو۔ جس طرح آدم و حوّا کو باغِ بہشت سے نکال دیا گیا تھا۔ مگر انھوں نے تو گناہ کیا تھا کشمیریوں نے کونسا گناہ کیا ہے! نشاط باغ کی تصویر دیکھتے ہوئے ذہن کے پردے پر ہزاروں بھوکے ننگے، غلیظ کشمیری اُبھر آتے ہیں جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر پکار رہے ہیں "بخشیش بخشیش۔ یا خدا میں ان سب کو کہاں سے بخشیش دوں" میں گھبرا کر اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا ہوں۔

"جہلم میں کھڑے ہوئے ہاؤس بوٹ دیکھے"

ضرور دیکھے لیکن ڈونگوں میں بیٹھی ہوئی غریب کشمیری عورتیں بھی دیکھے نا میں ایک بار شکارے میں سوار ہو کر ان کے قریب سے گذرا تھا اُف۔ چاندسی عورتیں اور غلیظ ترین فرغلوں میں ملبوس۔ ایسے فرغل جنھیں شاید صدیوں میں ایک بار دھویا جاتا ہے۔ وجہ؟ صابن خریدنے کے لئے پیسے نہیں۔ ان میں سے اکثر ڈونگوں کے ننگ، و تاریک چوبی کمروں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ڈونگوں میں پروان چڑھتی ہیں اور محنت مزدوری کرتے کرتے ڈونگوں میں ہی مرجاتی ہیں۔ سنا ہے ان میں کچھ ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی شادی نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ والدین بوڑھے ہیں اگر شادی ہوگئی تو انھیں مزدوری کرکے کون کھلائیگا۔

شادی! اور مجھے اس ادھیڑ عمر کے رشتہ دار پر رہ رہ کر غصہ آرہا ہے جس نے پینتالیس برس کی عمر میں ایک سترہ سالہ لڑکی سے دوسری شادی کی اور جو فخر سے

اپنے دوستوں سے کہتا پھرتا ہے "دو دھوا نہیں صاحب دوشیزہ ہے۔ ایک دم دوشیزہ مشکل سے سولہ سترہ برس کی ہوگی۔ لیکن صاحب مفت ہاتھ نہیں آئی۔ شادی کے سب اخراجات میں نے ادا کئے۔ اس کے علاوہ اس کے والدین کو نقد پانچ سو روپے بھی دئے۔ بیچارے شرنارتھی ہیں۔ سودا لیکن مہنگا نہیں رہا۔"

فرش پر لیٹے ہوئے نوجوان نے پھر فلک شگاف نعرہ بلند کیا "کوئی مجھ پہ آنسو بہائے کیوں" ۔۔۔ "ٹھیک کہتے ہو استاد" میں اس سے کہتا ہوں۔ ڈولی میں بیٹھی ہوئی حسین دوشیزہ نے بھی یہی کہا تھا۔

"تم ہی صرف بے کسی کا مزار نہیں ہو۔ اس ہندوستان میں ہزاروں ایسے مزار موجود ہیں۔

"بمبئی دیکھئے۔ میرین ڈرائیو کی سیر کیجئے"

ضرور سیر کریں گے لیکن پہلے فٹ پاتھوں پر لیٹی ہوئی مخلوق کے نظارے سے تو فارغ ہو لیں۔ میرین ڈرائیو کہیں بھاگی نہیں جاتی۔ ان لوگوں کا نظارہ کیوں نہ کریں جو ساون کے موسم میں ساری ساری رات پڑے بھیگتے رہتے ہیں۔ اور پانی ہے کہ برسے ہی چلا جاتا ہے۔ اور بمبئی میں ہزاروں خدا کے گھر ہیں۔ گرجے، مندر، مسجدیں جو رات کو خالی پڑے رہتے ہیں لیکن جہاں خدا کے بندوں کو جانے کی اجازت نہیں کیونکہ خدا بہت بڑا ہے۔ اسے سونے کے لئے بہت جگہ چاہیے۔

"راجستھان دیکھئے"

اس تصویر میں شادی کا منظر دکھایا گیا ہے۔ دولھا گھوڑے پر سوار ہے۔ اس کے

پیچھے پیچھے کہار ڈولی اٹھائے آرہے ہیں۔ باراتی رنگ برنگے لباسوں میں ملبوس پیچھے پیچھے چل رہے ہیں۔ کتنا دلفریب منظر ہے۔ لیکن اس سے دلفریب منظر تو میں بریلی میں دیکھ کر آرہا ہوں۔ جب دلہن رخصت ہوئی تھی تو ڈولی کے اوپر سے پیسے نچھاور کئے گئے تھے۔ بھوکوں کی ایک بہت بڑی فوج ان پیسوں کو حاصل کرنے کے لئے دیوانہ وار جھپٹی تھی۔ دو مزدور بچے آپس میں اس طرح ٹکرائے تھے کہ دونوں کے سر سے خون بہنے لگا تھا۔ اور ایک حاملہ مزدور عورت پیسے کو اٹھاتے اٹھاتے گندے نالے میں جا گری تھی جسے بڑی مشکل سے نکالا گیا تھا۔ اور ایک بوڑھا فقیر پیسے کا تعاقب کرتے ہوئے بری طرح زمین پر گر پڑا تھا۔ اور باقی محتاج اس کے جسم کو روندتے ہوئے آگے کو دوڑے تھے۔ کتنا پُر لطف تھا یہ منظر۔ لیکن اس سے بھی خوب تر وہ منظر تھا جب بارات کھانا کھا رہی تھی اور ہزاروں بھوکے لوگ نظروں میں صدیوں کی بھوک لئے قنات کے ارد گرد منڈلا رہے تھے اور منتظمین انھیں فحش گالیاں دے رہے تھے۔ "سالے۔ حرامزادے۔ بھک منگے۔ اوباش۔ خدا جانے گِدھوں کی طرح اتنے کہاں سے آجاتے ہیں۔ کسی کو کھانا بھی نہیں کھانے دیتے۔ بھاگ جاؤ۔ نہیں تو وہ مار پڑے گی کہ یاد رکھو گے ..... اچھا اچھا سن لیا۔ تم تین دن سے بھوکے ہو۔ سب یہی کہتے ہیں سالے ... اچھا، اچھا۔ بارات کھانا کھالے ..... بچا کھچا تم کو ضرور ملے گا اور کیا چاہتی ہو؟ ـــــ ایک پوری؟ نہیں۔ نہیں۔ کوئی پوری نہیں ملے گی۔ سالی۔ پوریاں تمھارے الیسوں کے لئے ہیں۔ بھی کھی کھی۔ ذرا اپنا منہ تو دیکھو۔ کھا کھا۔ پھر وہی ایک پوری؟ بھاگ جاؤ۔ تمھیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ ڈھیٹ کہیں کی!"

اور وہ عورت جو بھوک سے نڈھال ہو رہی تھی۔ جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا۔

آنکھوں میں بڑی حسرت لیئے ہوئے ایک طرف چلی گئی۔

نوجوان پھر چلاّ رہا ہے۔ کہ میں بیکسی کا مزار ہوں۔

ارے بھئی ہو گئے تم بےکسی کے مزار۔ سن لیا۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، دس دفعہ۔ لیکن محض چلاّنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمت کر کے اٹھ کیوں نہیں بیٹھتے اور مزار کو گرا کر اپنے لئے ایک شیش محل کیوں نہیں بنا لیتے۔

"دہلی دیکھئے۔ لال قلعہ دیکھئے۔"

ضرور دیکھیں گے لیکن اس تصویر میں آپ نے ان شرنارتھیوں کو کیوں نہیں دکھایا جو فصیل کے باہر اور فصیل کے اندر، سبزی منڈی میں، دریا گنج میں، آنند پربت کے نیچے، زندگی اور موت کے درمیان ٹنگ رہے ہیں۔ شاید آپ نہیں چاہتے کہ لوگ انھیں دیکھنے کے لئے آئیں اور آپ شرم سے پانی پانی ہو جائیں۔ کیا فائدہ مفت میں خفّت اٹھانے سے۔

پچھلے مہینے میں دہلی گیا تھا۔ اپنے ایک شرنارتھی رشتہ دار سے ملنے۔ چھ سال سے وہ ایک چھوٹی سی جھونپڑی میں کہ جو اس نے خود بنائی ہے رہ رہا ہے۔ یہ جھونپڑی کمیٹی کے حکم سے چار بار گرائی جا چکی ہے۔ اور چار بار بنائی گئی ہے۔ ہر بار اسے یقین دلایا جاتا ہے کہ کل اسے ایک نیا مکان رہنے کے لئے دیدیا جائے گا۔ لیکن آجتک وہ کل نہیں آئی۔ شاید کبھی نہیں آئے گی۔ اور ایک دن جب اُس کی ارتھی اُٹھ رہی ہو گی تو اُسے شمشان میں یہ مژدہ سنایا جائے گا کہ سرکار نے تمہارے لئے ایک نیا مکان تعمیر کر لیا ہے اگر چاہو تو شمشان کی بجائے اس میں آرام کر سکتے ہو۔

گاڑی اب آیا چاہتی ہے۔ مسافر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اپنے اپنے ٹرنک اور پوٹلیاں سنبھال رہے ہیں۔ میں بھی پلیٹ فارم پر جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ اور ساتھ ساتھ سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں سترہ سالہ حسین دوشیزہ کی تمناؤں کو اِس بیدردی سے مسلا جاتا ہے۔ جہاں سائیں بابا کو پرماتما کے نام پر پیسہ نہ دینے سے آدمی پاگل ہو جاتا ہے۔ جہاں بخشیش بخشیش کی صدائیں سن کر کان پک جاتے ہیں۔ جہاں ہر شخص بے کسی کا مزار ہے۔

ہندوستان دیکھئے! بہت دیکھ لیا صاحب اب اور کیا دیکھیں گے۔

دیوانہ گر نہیں ہے تو ۔ ۔ ۔ ۔

یک لخت وہ محفل میں وارد ہوئے اور سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ جو ذرا زیادہ کم ہمت تھے۔ دل ہی دل میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھنے لگے۔ وجہ یہ کہ نو وارد محمد تغلق کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ہمیشہ یہ ڈر رہتا ہے کہ خدا جانے وہ کس وقت کس سے کیا کہہ دیں۔ کرسی پر براجنے کے بعد انھوں نے اہلِ محفل کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور فرمایا: "یہ آج کلب میں غیر معمولی سناٹا کیوں ہے۔ کوئی بات کیجئے۔"

کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا: "تھک گئے ہیں۔"

"واہ تھکاوٹ کی بھی ایک ہی کہی۔ تھک گئے ہیں تو شیش آسن کیجئے۔ تھکاوٹ دور کرنے کا بہترین طریقہ ہے۔"

اور وہ سر کے بل کھڑے ہو کر شیش آسن کا مظاہرہ کرنے لگے۔ جب جی بھر کر مظاہرہ کر چکے تو کہا: "تندرستی کے لئے دو چیزیں اشد ضروری ہیں۔ شیش آسن اور السیب غول۔"

کلب کے کسی ممبر نے محض چھیڑنے کے لئے کہا: "اس دن تو آپ فرما رہے تھے کہ صحت کو برقرار رکھنے کے لئے ہر روز ایک آنولہ کھانا چاہیئے۔"

"آنولہ بھی اچھی چیز ہے۔ لیکن السیب غول کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"

"دودھ کے متعلق کیا ارشاد ہے۔"

دودھ کو تو میں زہر سمجھتا ہوں۔ دودھ اسی فی صد بیماریوں کا ذمہ دار ہے۔ چاہے

وہ ماں کا ہو یا بکری کا۔"

"بھینس کا دودھ تو شاید اتنا خراب نہیں ہوتا۔"

"بھینس کے دودھ سے بدتر شاید ہی کوئی چیز ہو گی۔ بھینس کا دودھ پینے والے کی عقل بھینس سے بھی موٹی ہو جاتی ہے۔ اس کی بجائے لیموں کا رس پینا چاہیئے اس میں وٹامن سی ہوتا ہے۔"

"سنا ہے وٹامن سی تو گھاس میں بھی ہوتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن سبز گھاس میں۔ خشک میں نہیں۔ خشک گھاس میں البتہ وٹامن ڈی ہوتا ہے۔"

"آپ سبز گھاس کھاتے ہیں یا خشک؟"

اس پر ایک زوردار قہقہہ لگا اور مجلس برخاست ہو گئی۔

کلب سے اٹھ کر گھر آئے۔ ابھی اخبار پڑھنے کے لیئے اٹھایا ہی تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لائے:

"برا نہ مانیئے گا۔" انہوں نے بڑی نرمی سے کہا "میں آپ کے پاس ایک شکایت لے کر آیا ہوں۔"

"کہیئے۔"

"آپ کے بچے بہت شور مچاتے ہیں۔ میں مطالعہ نہیں کر سکتا۔ مطالعہ کے بغیر ریسرچ نہیں ہو سکتی۔ اور ریسرچ کے بغیر پی ایچ ڈی کی ڈگری نہیں مل سکتی۔"

میں بچوں سے کہہ دوں گا کہ وہ شور نہ مچایا کریں۔"

"نہیں نہیں میرا یہ مطلب نہیں۔ شور وہ بیشک مچایا کریں لیکن جس وقت میں غسلخانے میں ہوتا ہوں اس وقت خاموش رہا کریں۔ بات یہ ہے کہ میں سوچنے کا کام غسلخانے میں کرتا ہوں۔ کچھ لوگ غسلخانے میں گانے لگتے ہیں یہ اوّل درجے کی بدمذاقی ہے۔ یہ تو ایسا

ہی ہے جیسے کوئی ڈرام میں ناچنے لگے۔"

"آپ ریسیرچ کس موضوع پر کر رہے ہیں؟"

"قطب مینار پر۔ میرا خیال ہے کہ قطب مینار کی گیارہ منزلیں تھیں سات نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ چار منزلیں کہاں گئیں۔

"غالباً وہ کوئی بیرونی حملہ آور اپنے ساتھ لے گیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ لیکن سوال پھر پیدا ہوتا ہے کہ وہ حملہ آور کون تھا ہندوستان میں کب آیا اور وہ صرف چار منزلیں اپنے ساتھ کیوں لے گیا۔ یعنی اس نے سالم قطب مینار کو اڑانا کیوں مناسب نہ سمجھا؟"

"ممکن ہے وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے لیکن اب سوال تیسری بار پیدا ہوتا ہے کہ کون سے حادثے کی۔ بھونچال۔ سیلاب۔ ٹڈی دل۔ میرا مطلب ہے حادثے بھی تو کئی ہو سکتے ہیں۔"

"بہرحال موضوع بہت دلچسپ ہے۔ ریسیرچ جاری رکھیے گا۔"

"ریسیرچ تو جاری رکھوں گا ہی لیکن آپ ذرا بچوں سے کہہ دیجیے کہ جب میں غسلخانے..."

"ہاں ہاں۔ وہ میں کہہ دوں گا۔"

صبح دفتر میں گئے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ بڑے صاحب یاد فرماتے ہیں۔ بڑے صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھوں نے اشارے سے کرسی پر بیٹھنے کیلئے کہا۔

"مسٹر رشید۔" انھوں نے فرمایا۔ "میں نے آپ کو ایک نہایت ضروری کام سے بلایا ہے۔"

"ارشاد۔"

"وہ ضروری کام یہ... ہے... یہ تھا... کہ... ہاں... وہ کہ... کیا

تھا وہ ضروری کام ...... اچھا آپ جا سکتے ہیں۔"

پندرہ بیس منٹ کے بعد انھوں نے پھر بلا بھیجا۔" ہاں مسٹر رشید وہ ضروری کام یاد آگیا۔ کل ہفتے کا کون سا دن تھا؟"

"جی اتوار۔"

"اچھا آپ جا سکتے ہیں۔"

آدھ پون گھنٹے کے بعد انھوں نے پھر یاد فرمایا۔" مسٹر رشید مجھے پتہ چلا ہے کہ آپ آفس میں سگریٹ پیتے ہیں۔ کیا یہ درست ہے۔"

"جی ہاں۔"

"دیکھیے آفس میں سگریٹ مت پیا کیجیے۔ اگر کسی فائل کو آگ لگ گئی، تو کون ذمہ دار ہوگا۔"

"آئندہ نہیں پیا کروں گا۔"

"اور ہاں۔ یہ سبز رنگ کی ٹائی پہن کر مت آیا کیجیے۔ مجھے سبز رنگ سے سخت نفرت ہے۔"

"بہت اچھا جناب۔"

"یہ آج آپ کی آنکھیں لال کیوں ہو رہی ہیں؟"

"غالباً اس لئے کہ رات گئے تک دفتر کا کام کرتا رہا۔"

"نہیں یہ وجہ نہیں ہو سکتی۔ آپ کا جگر خراب ہے۔ آپ گرم پانی کے کتنے گلاس روزانہ پیتے ہیں؟"

"گرم پانی تو نہیں البتہ چائے دو تین بار پیتا ہوں۔"

"چائے جگر کی نمبر دن دشمن ہے۔ چائے بالکل ترک کر دیجیے۔ گرم پانی کے گلاس پیا کیجیے۔"

"بہت اچھا جناب۔"

تین بجے کے قریب انھوں نے پھر بلا بھیجا: "مسٹر رشید۔ ابھی ابھی اطلاع آئی ہے کہ انسپکٹر صاحب کل یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اعزاز میں ایک پارٹی کی جائے اور آپ اور دفتر کے باقی ملازم پارٹی پر ایک قوالی گائیں۔"

"لیکن بندہ پرور قوالی ہم کیسے گائیں گے۔ میرا مطلب ہے کہ ہم میں سے کوئی....

"گانا نہیں جانتا۔ یہی مطلب ہے نا آپ کا۔"

"جی ہاں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ سیکھ سکتے ہیں۔"

"لیکن جناب ہم نے آج تک قوالی...."

"میں کوئی عذر سننے کے لئے تیار نہیں۔ قوالی آپ کو گانا ہوگی۔ یہ میرا حکم ہے۔ آپ ابھی سے اس کی تیاری کیجئے۔"

"لیکن جناب دیکھئے نا۔ ہم قوالی...."

"بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ آرڈر آرڈر ہے۔"

اپنا سا منھ لے کر دفتر سے باہر چلے آئے۔ تھکے ماندے گھر پہنچے۔ گراموفون پر کلّن قوال کی گائی ہوئی مشہور قوالی کا ریکارڈ لگایا۔ اور بیوی بچوں کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر گانے لگے۔

دیکھا ہے ہم نے جلوت و خلوت میں اسد کو
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

جمود

جب متواتر آٹھ سال یہ سنتے سنتے دم ناک میں آ گیا کہ ہندوستانی ادب پر جمود بری طرح مسلط ہو گیا ہے اور وہ ادب میں اضافہ کرنے سے قاصر ہیں تو یونہی ایک دن شوق چرایا کہ اس جمود کے اسباب دریافت کئے جائیں۔ حسنِ اتفاق سے محلّے میں ایسے لوگ رہائش پذیر تھے جنھیں مکان کا کرایہ ادا کرنے کی توفیق اکثر کم ہوتی تھی لیکن جنھیں اہلِ قلم کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم نے جناب خشک اصفہانی کے دولت خانے کا رُخ کیا۔ جناب خشک دودھ اور چینی کے بغیر ایک چائے کا پیالہ نوش فرمانے میں مصروف تھے۔ آداب بجا لانے کے بعد عرض کیا: "میں ایک خاص کام سے حاضر ہوا ہوں۔"

"فرمائیے۔" جناب خشک نے چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

"اک زمانہ تھا خشک صاحب کہ آپ کے کلام کی دھوم تھی اور آپ کے تکیہ کلام "عرض کیا ہے" سے دوست دشمن پناہ مانگتے تھے۔ لیکن اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے آپ کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ کیا اس انقلاب پر آپ کچھ روشنی ڈالیں گے؟"

سوال ملاحظہ فرمانے کے بعد جناب خشک نے اپنے سینے پر زور سے ایک دو ہتھڑ مارا۔ پھر چھت کی طرف دیوانہ وار نظریں دوڑائیں اور چیخنے کے انداز میں بولے۔ "ظالم! یہ تم نے کس دور کی یاد دلائی۔ آہ! واقعی کیا زمانہ تھا وہ بھی۔ غزلیں

ہیں کہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح اُمڈی چلی آتی ہیں۔ قافیے ہیں کہ ہاتھ باندھے کھڑے ہیں۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ بقولِ شاعر ؎

مدت ہوئی ہماری منقار زیرِ پر ہے

مہینوں فکرِ سخن کرتا ہوں۔ لیکن ایک مصرعہ نہیں ہوتا۔"

"یہ تو آپ بجا فرما رہے ہیں۔ لیکن وجہ؟"

"وجہ! ارے بھئی وہ جمود ہی کیا۔ جو یہ سوچنے کی مہلت یا اجازت دے کہ اس کے طاری ہونے کی وجہ کیا ہے۔"

"تو گویا آپ پر بیٹھے بٹھائے جمود نے حملہ کر دیا۔"

"جی ہاں۔ اور کچھ اس شدت سے کہ دماغ منجمد ہو کر رہ گیا۔ اب تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ختم ہو گئے۔"

"لیکن اس حیرت ناک بلکہ عبرتناک تبدیلی کی کچھ وجہ تو ہو گی۔ آپ کو کسی ماہرِ نفسیات سے مشورہ کرنا چاہیے تھا۔"

"کر چکا ہوں صاحب۔ کر چکا ہوں۔ ایک نہیں تین بار۔"

"تو کیا کہا اُس نے؟"

"کہنے لگا تمھارے لاشعور میں گڑبڑ ہے۔"

"لاشعور میں گڑبڑ!"

"ہاں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بچپن میں جب ہم نے پہلا شعر کہا تھا تو نرس نے بُری طرح ڈانٹ دیا تھا۔ ساتھ ہی تنبیہہ کی تھی کہ شریف زادے رومانی اشعار نہیں کہا کرتے۔"

"اگر یہ بات ہے تو آپ اتنے برس شاعری کس طرح کرتے رہے۔"

"ممکن ہے۔ لاشعور کو زس کی ڈانٹ بعد میں یاد آئی ہو۔"

"آپ کے خیال میں آپ پر جمود کب تک طاری رہے گا۔"

"کچھ کہہ نہیں سکتے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے عمر بھر اس کمبخت سے نجات نہ ملے گی۔"

"عمر بھر؟"

"جی ہاں۔ میں تو کئی بار اس سے عرض کر چکا ہوں ؎

بہت دن رہے حضرتِ غم یہاں
کرم کرتے اب اور گھر دیکھئے

لیکن یہ ٹلنے کا نام نہیں لیتا۔"

"تو گویا آپ کا مرض لا علاج ہے۔"

خشک صاحب سے اجازت لیکر ہم جناب اُجاڑ شکارپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

"اُجاڑ صاحب۔ آپ بھی جمود کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔" ہم نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔"

"لیکن معاملہ کیا ہے۔ ہمارا مطلب ہے۔ آپ تو بھلے چنگے ہوا کرتے تھے۔"

"آپ کا اشارہ شاید ماضی بعید کی طرف ہے۔"

"بجا فرماتے ہیں آپ۔"

"دراصل میں واقعی بھلا چنگا ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب دو سال سے کچھ۔ ۔ ۔"

"ہاں ہاں کچھ؟"

"چکر میں ہوں۔"

"کونسے چکر میں ؟"

"بات دراصل یہ ہے کہ جب میری طویل نظم "ابابیل سے عقاب تک" شائع ہوئی تو ایک نقاد نے کہا کہ میں اُردو ادب کا ٹی ایس ایلیٹ ہوں دوسرے نے فتویٰ دیا۔ میں ڈبلیو ایچ آڈن ہوں۔ اب میں ہر وقت یہ سوچتا رہتا ہوں کہ میں ایلیٹ ہوں یا آڈن ہوں آڈن ہوں یا ایلیٹ۔"

"آپ کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ آپ اُجارہ داری ہیں اس لئے اس چکر سے نکلئے اور کچھ لکھئے۔"

"وہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن اگر ایک آدمی صرف ایک طویل نظم لکھنے کے بعد ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ یا ڈبلیو۔ ایچ۔ آڈن بن جائے تو پھر اسے زیادہ لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تو گویا آپ کے جمود کی ذمہ داری نقاد حضرات پر عائد ہوتی ہے۔"

"درست فرماتے ہیں آپ۔"

اب ہم نے مشہور افسانہ نویس جناب بنجر صحرائی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ بنجر صاحب کے ملازم سے معلوم ہوا کہ موصوف عرصے سے مراقبے میں ہیں۔ پڑھنا لکھنا ترک کر رکھا ہے۔ ہر وقت غالب کا مصرع دُہراتے رہتے ہیں۔ ؎ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے۔ بڑی مشکل سے انہیں مراقبے میں سے باہر آنے پر مجبور کیا۔ اور اس سے پیشتر کہ وہ پھر مراقبے میں چلے جاتے، سوال داغ دیا۔

"بنجر صاحب۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ افسانہ نویسی سے توبہ کیوں کر لی ؟"

"منیجر صاحب نے سرد آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔" یہ سب میرے اعصاب کا قصور ہے۔"

"اعصاب کا؟ خدانخواستہ آپ کسی اعصابی مرض میں تو مبتلا نہیں ہوگئے ہیں؟"

"نہیں یہ بات نہیں۔ در اصل میں تب تک افسانہ نہیں لکھ سکتا جب تک میرے اعصاب پر کوئی نہ کوئی چیز سوار نہ ہو جائے۔ شروع میں بقولِ اقبال عورت سوار تھی۔ چنانچہ میں نے عورت کی زلف سے لے کر ٹخنے تک ہر موضوع پر افسانے لکھ ڈالے۔ جب عورت نیچے اتری تو فرائیڈ سوار ہو گیا۔ اب میں نے شعور اور لاشعور کی بھول بھلیاں پر جو لکھنا شروع کیا تو دوسروں کی بات تو الگ رہی۔ خود میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ لکھ کیا رہا ہوں۔ فرائیڈ صاحب رخصت ہوئے تو کارل مارکس لپک کر سوار ہو گئے۔ اب دن رات بھونچال، ہڑتال، سرخ سویرا، سرخ دوپہر، سرخ ستارا ایسے موضوعات پر لکھنے لگا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب کارل مارکس تشریف لے گئے تو اعصاب کی کرسی خالی ہو گئی۔ اب میں انتظار کر رہا ہوں کہ کوئی شخص آئے اس کرسی پر بیٹھے اور میں لکھنا شروع کروں۔"

"کب تک انتظار کیجئے گا ہمت سے کام لے کر کسی موضوع پر لکھ کیوں نہیں ڈالتے۔"

"اجی حضرت یہی تو مصیبت ہے۔ موضوعات ہی ختم ہو گئے۔ لکھوں کس پر؟"

"آخر موضوعات کس طرح ختم ہو سکتے ہیں؟"

"آپ نے شاید گھوڑی کے ختم ہو جانے والا قصہ نہیں سُنا۔"

"وہ کیا ہے۔ سُنا دیجئے۔"

"کوئی مسخرا پہلی بار گھوڑی پر سوار ہوا اور تھوڑی دیر میں زمین پر آ رہا۔ احباب نے

پوچھا۔ بات کیا ہوئی۔ کہنے لگا۔ یہ سب گھوڑی کا قصور ہے۔ پہلی بار جب وہ اچھلی تو
میں اس کی گردن پر آ گرا۔ دوسری بار اُچھلی تو میں اس کے کانوں پر بیٹھا ہُوا نظر
آیا۔ تیسری بار اُچھلی تو میں زمین پر تھا۔ جب گھوڑی ہی ختم ہو گئی تو اس پر بیٹھنے ا
کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔"

"بہت خوب۔ آپ کا طرزِ استدلال لاجواب ہے۔"

بنجر صاحب سے رخصت ہو کر ہم فضول بٹالوی کے ہاں پہنچے۔

"فضول بٹالوی صاحب" ہم نے بڑے ادب سے کہا۔ "جمود کے بارے میں آپ
کا کیا خیال ہے۔"

"جمود!" فضول بٹالوی نے چلّا کر کہا۔ "کہاں ہے جمود۔ کدھر ہے جمود۔ کیسا جمود!
بڑی انکساری سے عرض کیا۔ غالباً آپ کو معلوم ہو گا کہ ادبار پر جمود طاری ہو گیا
ہے۔

"کون سے ادبار پر؟"

"یہی ۔۔۔ اپنے ہندوستانی ادبار پر۔"

"آپ سے کس نے کہا۔"

"اجی کہنا کس نے تھا۔ یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے۔"

"بالکل غلط۔ یہ جمود ہرگز نہیں ہے۔"

"کیسے؟"

"دیکھیے خاکسار نے صرف پچھلے پانچ مہینوں میں پانچ ناول، پچیس افسانے ا
پچاس مضامین لکھے۔ ان تخلیقات کی موجودگی میں آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ادبار پر جمو

طاری ہے۔"

"آپ نے یہ سب کچھ کیسے لکھ لیا"

"یہ میرا تجارتی راز ہے۔ یہ میں آپ کو کیسے بتا سکتا ہوں"

"پھر بھی باقی ادبار کی رہنمائی کے لئے اگر آپ ایک آدھ اشارہ . . . ."

"مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ یہ چل میرے خامے بسم اللہ کی برکت ہے۔ مثلاً میں نے ایک ناول لکھا "پیاری دلہن" کوئی دوسرا ادیب ہوتا تو اسے لکھنے کے بعد صبر یا آرام کرتا۔ لیکن میں نے فوراً دوسرا ناول شروع کر دیا "دلاری دلہن" اور پھر "ہماری دلہن" "تمھاری دلہن" حتےٰ کہ "کنواری دلہن" جب یہ سلسلہ بفضل خدا ختم ہوا تو میں نے ایک اور سلسلہ شروع کر دیا "رات کی رانی" "برسات کی رانی" "جذبات کی رانی" اور "واردات کی رانی" علیٰ ہذا القیاس۔"

"تو آپ کے خیال میں جمود نام کی کوئی چیز نہیں۔"

"جمود کہاں ہے قبلہ۔ یہ تو دماغی خشکی ہے۔ حکما نے اس کا علاج بادام روغن بتایا ہے۔"

"گویا جن ادبار کو جمود کی شکایت ہے انھیں بادام روغن کی اشد ضرورت ہے۔"

"بادام روغن کے علاوہ ایک اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ ہے . . ."

"ہاں وہ کیا ہے۔"

"وہ ہے گوند۔"

"گوند۔ کیا مطلب ؟"

"دیکھئے جب تک ادیب اپنی کرسی پر گوند لگا کر اس پر نہ بیٹھے۔ وہ جم کر بیٹھ نہیں

سکتا۔ اور جم کر نہ بیٹھے تو لکھ نہیں سکتا۔"

"سبحان اللہ۔ کیا لاجواب نسخہ ہے۔ بادام روغن اور گوند۔"

"جی ہاں۔ ادبا سے کہئے کہ گوند اور بادام روغن کا باقاعدہ استعمال کریں اگر جمود کا بھوت دُم دبا کر نہ بھاگ جائے تو فضول ٹبالوی نام نہیں۔"

فضول ٹبالوی سے رخصت ہو کر ہم جب گھر لوٹے تو خدا کا شکر بجا لائے کہ گو جمود کے اسباب دریافت نہیں کر سکے۔ کم از کم اس کے علاج کا تو پتہ چل گیا۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ جناب فضول ٹبالوی کے نسخے پر عمل کرنے سے اعلیٰ ادب کی تخلیق ہو بھی سکتی ہے یا نہیں۔ بہر حال نہ لکھنے سے کچھ لکھنا بہتر ہے۔ "بالِ جبریل" اور "چوگانِ ہستی" نہ سہی۔ "کنواری دلہن" اور "برسات کی رانی" ہی سہی!

ہدیۂ عقیدت

بات معمولی ہے لیکن اب اس کا کیا جائے کہ کبھی کبھی معمولی بات پر بھی گھر میں جھگڑا ہو جاتا ہے۔ آج صبح ایک نو وارد مجھے ایک تربوز پیش کرنے آیا تھا۔ میں نے شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اسی پر ایک گھنٹے سے اہلیہ محترمہ سے بحث چل رہی ہے۔ محترمہ کا خیال ہے کہ میں نے یہ تحفہ واپس کر کے اپنے ایک مداح کی دل شکنی کی ہے۔ لاکھ سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں کہ ایسے تحفے بہت مہنگے پڑتے ہیں لیکن محترمہ ہیں کہ مانتی ہی نہیں۔ اب انھیں کون بتائے کہ دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ . . زیادہ عرصہ نہیں گذرا یہی کوئی ایک سال کی بات ہے کہ اسی طرح ایک نوجوان تشریف لائے۔ میں اس وقت ایک ناول پڑھ رہا تھا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" انھوں نے اندر داخل ہونے کے بعد پوچھا۔

"تشریف لے آئیے" میں نے آہستہ سے کہا۔

"وہ تو میں لے ہی آیا ہوں" انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے فرمایا۔

"معاف کیجیے گا۔ آپ مجھے نہیں جانتے۔ جان بھی کیسے سکتے ہیں۔ جبکہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ خاکسار کو شمس نظامی کہتے ہیں اور بندہ آپ کا غائبانہ مداح ہے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کہ آپ کا شرف نیاز حاصل کیا جائے لیکن کبھی فرصت ہی نہیں ملی خاکسار نے آپ کی لکھی ہوئی تمام کتابیں پڑھی ہیں اور بندے کی رائے ہے کہ ٹیگور اور پریم چند کے

بعد آپ ہندوستان کے سب سے بڑے ادیب، شاعر اور افسانہ نویس ہیں۔"
"آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں کیا ہوں۔" میں نے کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ کہئے کیسے تشریف لائے۔

"بس یونہی آپ سے ملاقات کرنے اور آپ جانتے ہیں کہ ع
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیئے
اس لئے آپ کی خدمت میں ایک ناچیز ہدیۂ عقیدت پیش کرنا چاہتا ہوں۔"
یہ کہہ کر انھوں نے اپنے تھیلے سے ایک بہت وزنی "سردہ" نکالا۔ اور کہا۔
"یہ کابل کا سردہ ہے۔ خاص آپ کے لئے کابل سے منگوایا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ سالم کا سالم آپ خود کھائیں بخدا مجھے بہت خوشی ہوگی۔ میں محسوس کروں گا جیسے یہ سردہ آپ نہیں کھا رہے میں کھا رہا ہوں۔"
"آپ نے خواہ مخواہ تکلف کیا۔ اس کی کیا ضرورت تھی۔"
"نہیں نہیں۔ بالکل نہیں۔ سردہ ہی ہے۔ امرود تو نہیں۔" "نظام شمسی صاحب۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ امرود کی بات بھی خوب رہی۔ کہاں سردہ! اور کہاں امرود۔"
"جی معاف کیجئے۔ میرا نام نظام شمسی نہیں۔ شمس نظامی ہے۔ میں ہمیشہ بڑی چیز کا مقابلہ چھوٹی چیز سے کرتا ہوں۔ یہ میری عادت ہے۔ ابھی کل میرے ایک دوست کہنے لگے کہ انھیں ٹائیفائیڈ ہو گیا ہے۔ میں نے برجستہ کہا۔ میاں گھبراتے کیوں ہو۔ ٹائیفائڈ ہی ہے، زکام تو نہیں۔ ہی ہی ہی۔ کہئے کیسی رہی۔ آپ تو ادیب ہیں۔ داد دیجئے ناس مزاحیہ فقرے کی۔"
"کیا بات ہے واللہ۔ آپ نے نہایت اچھوتی بات کہی۔"

"آداب عرض!"

"اچھا تو نظام شمسی۔ اوہ معاف کیجیے شمس نظامی صاحب۔ آپ شغل کیا فرماتے ہیں؟"

"کوئی خاص شغل نہیں۔ میرا مطلب ہے مستقل شغل نہیں۔ طرح طرح کے پاپڑ بیلتا رہتا ہوں کسی زمانے میں معلم تھا۔ پھر چھوٹا سا ہوٹل کھول لیا۔ ہوٹل نہ چلا تو چمڑے کا بیوپار شروع کر دیا۔ اس میں خاص فائدہ نہ ہوا۔ آج کل تو ایک لانڈری کھول رکھی ہے۔ اُسے بھی جلد بند کرنے کا ارادہ ہے۔ پھر کبھی مفصل عرض کروں گا۔ اب اجازت دیجیے۔ آداب عرض۔"

وہ تشریف لے گئے اور میں سوچنے لگا عجیب قماش کے انسان سے پالا پڑا ہے۔ یا تو بہت سادہ لوح واقع ہوا ہے یا بہت چالاک۔ ممکن ہے اسے ادب سے شغف ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بیچارے کے دماغ کی ایک آدھ چول ڈھیلی ہو بہر حال ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اہلیہ محترمہ سے جب سرے کا ذکر کیا تو ان کی باچھیں کھل گئیں۔ کہنے لگیں "شکر ہے۔ اتنی مدت کے بعد آپ کو ایک کام کا مداح ملا۔ ورنہ بیشتر تو ایسے ملے کہ گھر کو ہوٹل سمجھ کر تین تین دن ضیافتیں اڑائیں اور رخصت ہوتے وقت کرایہ ریل بھی آپ ہی سے طلب کیا ہے۔"

"نہیں نہیں۔ آپ مبالغہ سے کام لے رہی ہیں۔ میرے مداح ایسے نہیں ہیں۔ یاد ہے وہ راجیش۔"

"ہاں ہاں یاد ہے۔" محترمہ نے چمک کر فرمایا "وہی جو کہتا تھا کہ آپ کو فلم کمپنی میں ملازمت دلوا دوں گا۔"

میں اپنی رسٹ واچ کے بارے میں سوچ کر خاموش ہو گیا۔ وہ مجھ سے مانگ لے

گئے تھے۔

دو ایک دن کے بعد شمس نظامی صاحب پھر تشریف لائے اور کمرے میں داخل ہوتے ہی کہنے لگے "اخاہ۔ خوب ملے۔ جلدی سے تیار ہو جایئے فرسٹ شو شروع ہونے والا ہے۔"

میں نے پوچھا "قبلہ بات کیا ہے؟"

ایک بلند قہقہہ لگا کر فرمایا "بات بالکل صاف ہے۔ میرے پاس سینما کے دو پاس ہیں۔ فرسٹ کلاس کے۔ وہ کرشنا ٹاکیز کے منیجر ہیں نا لالہ شمبھو دیال آپ شاید انھیں نہیں جانتے۔ آدمی شریف ہیں۔ کپڑے میری ہی لانڈری سے دھلواتے ہیں۔ میں ایک آدھ کپڑا مفت دھلوا دیتا ہوں۔ اور وہ کبھی کبھار سینما کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ خیر اب جلدی کیجئے۔ کہیں فلم شروع ہی نہ ہو جائے۔"

میں کپڑے پہن کر تیار ہو گیا اور وہ مجھے کشاں کشاں کرشنا ٹاکیز لے گئے۔ کوئی سٹنٹ (STUNT) فلم تھی۔ مار دھاڑ۔ جوتم پیزار۔ اچھل کود سے بھرپور۔ مجھے خاک لطف نہ آیا۔ لیکن شمس صاحب ہر سین پر کرسی سے اچھل اچھل کر داد دیتے رہے فلم دیکھنے کی بجائے میں شمس صاحب کی حرکتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ فلم ختم ہونے کے بعد شمس صاحب نے کہا۔

"آپ نے جب بھی سینما جانا ہو۔ مجھے کہلوا بھیجئے گا۔ میں فری پاس کا انتظام کر دوں گا۔"

شمس صاحب کا شکریہ ادا کر کے جب میں گھر لوٹا تو ایک بار پھر سوچنے لگا کہ شمس صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں۔ اب دیکھئے نا بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ مجھے سٹنٹ فلم

دکھانے لیے گئے۔ اہلیہ سے جب اِس واقعہ کا ذکر کیا تو اُنھوں نے کہا: "بھلے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے آپ سے بے پناہ عقیدت ہے۔ ورنہ آج کل کون کسی کو پوچھتا ہے۔"

کوئی دو ہفتے کے بعد شمس صاحب ایک دن یک لخت وارد ہوئے اور آتے ہی کہنے لگے: "ایک ضروری کام سے آیا ہوں۔ اگر آپ تھوڑی سی مدد کریں تو کام بن سکتا ہے۔"

"فرمایئے۔" میں نے کہا۔

"میرا ایک بہنوئی دو سال سے بیکار ہے۔ وہ میرے ہاں ہی ٹھہرا ہوا ہے۔ ایف اے فیل ہے۔ تھوڑا بہت ٹائپ کرنا بھی جانتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں ایک ٹائپسٹ کی آسامی خالی ہوئی ہے۔ اگر آپ ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہہ دیں۔۔۔"

"لیکن شمس صاحب میری تو ڈپٹی کمشنر صاحب سے کوئی واقفیت نہیں ورنہ۔۔۔"

"اجی رہنے دیجیے۔" اُنھوں نے میری بات کاٹ کر کہا: "بھلا آپ کو کون نہیں جانتا۔ اتنے بڑے ادیب، اتنے مشہور شاعر۔ اور پھر وہ ڈپٹی کمشنر ہے۔ کوئی تحصیلدار تو نہیں۔ آپ ایک بار کہیں تو سہی۔"

بہتیرا اُنھیں سمجھایا کہ میں نے آج تک کسی کی سفارش نہیں کی اور اگر کبھی کی ہے تو کام نہیں بنا۔ لیکن وہ کچھ اس طرح مصر ہوئے کہ محض ٹالنے کی خاطر میں نے کہا: "اچھا ان سے کہہ دوں گا۔"

دس پندرہ دن کے بعد شمس صاحب سے سرِراہ ملاقات ہوئی۔ بہت خوش نظر آتے تھے۔ کہنے لگے: "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ آپ کے کہنے سے کام بن جائے گا۔

صاحب نے میرے بہنوئی کو ملازم رکھ لیا۔ حالانکہ ڈیڑھ سو امیدوار تھے۔ ۔ بہت بہت شکریہ۔"

حالانکہ میں نے ڈپٹی کمشنر سے ذکر تک نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے کہ شمس صاحب مفت میں میرا احسان مان رہے ہیں۔ میں نے بھی رسمی طور پر کہہ دیا۔ "نہیں شمس صاحب شکریہ کی کیا بات ہے۔ وہ تو میرا فرض تھا۔"

"دوبارہ شکریہ" شمس صاحب نے کہا۔ "ہاں اگر کوئی گرم کپڑا دھلوانا ہو تو لانڈری میں بھجوا دیجیئے گا۔"

اس کے بعد شمس صاحب کافی عرصے تک نہ ملے۔ ایک اتوار کو جب میں حجامت بنا رہا تھا، وہ چپکے سے کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے "قبلہ غضب ہو گیا۔"

میں نے گھبرا کر پوچھا "معاملہ کیا ہے۔"

"بس کچھ نہ پوچھیے۔"

"پھر بھی۔"

"وہ جو میرے بہنوئی تھے۔ یاد ہے نا جنھیں آپ نے ملازمت دلوائی تھی۔ ان سے ایک بڑی عجیب حرکت سرزد ہو گئی۔"

"کیا مطلب؟"

"انھوں نے دفتر سے ایک ٹائپ مشین چرالی۔ گرفتار کر لئے گئے۔ اب حوالات میں ہیں۔ عجیب مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اگر آپ کچھ کرم فرمائی کریں۔ ۔ ۔ ۔"

"لیکن شمس صاحب میں اس معاملے میں کیا کر سکتا ہوں؟"

"آپ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ذرا تھانیدار صاحب سے کہہ دیجیئے کہ معاملہ رفع

دفع کردیں۔"

"لیکن میں تھانیدار صاحب کو بالکل نہیں جانتا۔"

"کوئی بات نہیں وہ آپ کو ضرور جانتے ہوں گے بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ جیسے عظیم شاعر اور مشہور ادیب کو نہ جانتے ہوں۔"

"اچھا جلدی کیجئے۔ اُٹھئے وقت بہت تھوڑا ہے۔"

"لیکن قبلہ میں سچ کہتا ہوں۔ میری ان سے بالکل رسم و راہ نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں آپ کا تعارف کرا دوں گا۔۔۔"

"ہاں ذرا وہ "ماہِ تاباں" کا پرچہ ساتھ لیتے چلئے۔ وہی جس میں آپ کی وہ غزل چھپی ہے۔"

میرے انکار کرنے کے باوجود شمس صاحب مجھے تھانیدار صاحب کے پاس لے گئے اور میرا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے۔" جناب متجر دہلوی سے ملئے آپ اِس دَور کے سب سے بڑے شاعر، ادیب اور ناولسٹ ہیں۔ آپ نے ان کا نام ضرور سنا ہو گا۔"

تھانیدار صاحب نے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ کہا۔ "مَیں نے تو نہیں سُنا۔"

"نام نہیں سُنا تو آپ نے ان کا کلام ضرور سنا ہو گا۔ مشاعروں میں تو آپ ضرور جاتے ہوں گے۔"

"جی نہیں۔ مجھے اپنے کام سے فرصت ہی کب ملتی ہے کہ مشاعروں میں وقت ضائع کروں۔"

"تو آپ رسائل تو ضرور پڑھتے ہوں گے۔ "ماہِ تاباں" میں اکثر ان کی غزلیں

شائع ہوتی ہیں۔"

"میں "ماہِ تاباں" نہیں پڑھتا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔" شمس صاحب نے مایوس نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بہرحال اس سے سنجر صاحب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مانے ہوئے ادیب ہیں۔"

"پھر" تھانیدار صاحب نے اسی بے رُخی سے کہا۔

"یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"اکیلے میں آپ سے کچھ عرض کریں گے۔"

"اچھا تو آپ باہر تشریف لے جائیں۔"

شمس صاحب باہر چلے گئے۔ میں نے تھانیدار صاحب کے پُر جلالی چہرے سے مرعوب ہو کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شمس صاحب کے بہنوئی کے متعلق کچھ کہا۔ تھانیدار صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کو مجرموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیئے۔ بات ٹھیک تھی۔ میں اُن سے معذرت کر کے باہر آ گیا۔ شمس صاحب نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ "کچھ بنا۔"

میں نے انھیں مبہم الفاظ میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔"

ایک مہینے کے بعد کچھ نہ کچھ یہ ہوا کہ ان کے بہنوئی کو ایک سال قید بامشقت ہو گئی۔

اس کے بعد شمس صاحب کا آنا جانا کچھ کم ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ مجھے کبھی سفارش کرنے کے لئے نہیں

ے جائیں گے۔

ایک دن صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک نظر ایک سُرخی پر پڑی۔ لکھا تھا۔ "شمس لانڈری پر چھاپہ" خبر پڑھنے پر پتہ چلا کہ پولیس نے کل رات شمس لانڈری پر چھاپہ مارا۔ اور چوری کا مال برآمد کیا اور شمس صاحب کے نوکر کو گرفتار کرلیا گیا۔ شمس صاحب رُوپوش ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ دل نے کہا۔ شمس صاحب آدمی تو ایسے معلوم نہیں ہوتے۔ خدا جانے یہ کیا بات ہے۔ اہلیہ سے ذکر کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ پولیس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس واقعہ کے دو تین دن بعد شمس صاحب شام کے وقت میرے گھر آئے۔ نہایت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے" قبلہ سنجر صاحب سخت وقت آن پڑا ہے۔ مدد کیجیے۔"

"لیکن یہ سلسلہ کیا ہے" میں نے پوچھا۔

"بات تو کچھ بھی نہیں۔" انھوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا" میرا ایک دوست غلطی سے کسی کی سائیکل اُٹھا لایا اور اسے میری لانڈری میں رکھ گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کردی اور مفت میں میں پھنس گیا۔"

"مگر وہ آپ کا دوست کہاں ہے؟"

"لاپتہ ہے۔"

"تو پھر؟"

"شک مجھ پر کیا جا رہا ہے۔ میں دو تین دن اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ

شائع ہوتی ہیں۔"

"میں "ماہِ تاباں" نہیں پڑھتا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔" شمس صاحب نے مایوس نہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بہر حال اس سے سنجر صاحب کی عظمت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ مانے ہوئے ادیب ہیں۔"

"پھر" تھانیدار صاحب نے اسی بے رُخی سے کہا۔

"یہ آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"اکیلے میں آپ سے کچھ عرض کریں گے۔"

"اچھا تو آپ باہر تشریف لے جائیں۔"

شمس صاحب باہر چلے گئے۔ میں نے تھانیدار صاحب کے پُر جلال چہرے سے مرعوب ہو کر ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں شمس صاحب کے بہنوئی کے متعلق کچھ کہا۔ تھانیدار صاحب بہت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے کہ پڑھے لکھے آدمیوں کو مجرموں کی سفارش نہیں کرنی چاہیئے۔ بات ٹھیک تھی۔ میں اُن سے معذرت کر کے باہر آ گیا۔ شمس صاحب نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا "کچھ بنا۔"

میں نے انھیں مبہم الفاظ میں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہ کچھ ہو ہی جائیگا۔" ایک مہینے کے بعد کچھ نہ کچھ یہ ہوا کہ ان کے بہنوئی کو ایک سال قید بامشقت ہو گئی۔

اس کے بعد شمس صاحب کا آنا جانا کچھ کم ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ اب وہ مجھے کبھی سفارش کرنے کے لئے نہیں

ے جائیں گے۔

ایک دن صبح کا اخبار پڑھ رہا تھا کہ اچانک نظر ایک سُرخی پر پڑی۔ لکھا تھا۔ "شمس لانڈری پر چھاپہ" خبر پڑھنے پر پتہ چلا کہ پولیس نے کل رات شمس لانڈری پر چھاپہ مارا۔ اور چوری کا مال برآمد کیا اور شمس صاحب کے نوکر کو گرفتار کر لیا گیا۔ شمس صاحب رُوپوش ہیں۔ یہ خبر پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ دل نے کہا۔ شمس صاحب آدمی تو ایسے معلوم نہیں ہوتے۔ خدا جانے یہ کیا بات ہے۔ اہلیہ سے ذکر کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ پولیس کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔

اس واقعہ کے دو تین دن بعد شمس صاحب شام کے وقت میرے گھر آئے۔ نہایت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ لڑکھڑائی ہوئی آواز میں مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "قبلہ سنجر صاحب سخت وقت آن پڑا ہے۔ مدد کیجیے۔"

"لیکن یہ سلسلہ کیا ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بات تو کچھ بھی نہیں۔" انھوں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ "میرا ایک دوست غلطی سے کسی کی سائیکل اُٹھا لایا اور اسے میری لانڈری میں رکھ گیا۔ کسی نے پولیس کو خبر کر دی اور مفت میں میں پھنس گیا۔"

"مگر وہ آپ کا دوست کہاں ہے؟"

"لاپتہ ہے۔"

"تو پھر؟"

"شک مجھ پر کیا جا رہا ہے۔ میں دو تین دن اِدھر اُدھر ہو گیا تھا۔ لیکن پھر سوچا کہ

بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ سو چا کیوں نہ خود ہی اپنے آپ کو پیش کر دوں۔

" تو کر دیجئے۔ ہرج ہی کیا ہے۔"

" لیکن ایک ضمانت کی ضرورت ہے۔"

" کسی دوست سے کہہ دیجئے کہ آپ کی ضمانت . . . . "

" یہی تو مصیبت ہے۔ کوئی دوست ضمانت دینے کو تیار نہیں۔"

" عجیب بات ہے۔"

" دو ایک لمحے شمس صاحب چُپ رہے۔ پھر یک لخت میری طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔" آپ میری ضمانت کیوں نہیں دیدیتے۔ صرف ایک ہزار کی ہی تو بات ہے اور پھر میں ایسا آدمی تو ہوں نہیں کہ آپ کو کسی قسم کا خدشہ ہو۔"

" وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں اس جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتا۔"

" دیکھیے۔" انھوں نے گڑگڑا کر کہا۔" اتنے سنگدل نہ بنئے۔ میری عزت کا معاملہ ہے اور پھر . . . . اور پھر آپ پر تو میرا خاص حق بھی ہے۔"

شمس صاحب سے کوئی آدھ گھنٹہ بحث کرتا رہا۔ کہ مجھے معذور سمجھیں لیکن وہ کسی طرح بھی مجھے بخشنے پر رضامند نہ ہوئے۔ آخر یہ سمجھتے ہوئے کہ صرف ایک ہزار کی ضمانت ہے۔ میں رضامند ہو گیا۔

ضمانت دیدی گئی۔ اور شمس صاحب کو پندرہ تاریخ کو عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا گیا۔ پندرہ تاریخ ابھی دور تھی۔ اس اثنا میں شمس صاحب دو تین بار میرا شکریہ ادا کرنے آئے۔ ایک دن باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ لانڈری کا کام کچھ منافع بخش ثابت نہیں ہوا۔ اس لئے انھوں نے لانڈری فروخت کر دی ہے

اب بکری کھو لنے کا خیال ہے۔ پندرہ تاریخ کی صبح کو میں شمس صاحب کے گھر گیا۔ انھیں یاد دلانے کے لئے کہ آج عدالت میں ان کی پیشی ہے۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ کل رات شمس صاحب شہر چھوڑ کر چلے گئے۔ ان کے دوستوں اور واقفکاروں سے پوچھا کہ وہ کہاں گئے کوئی پتہ نہ چلا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیٹھے بٹھائے ایک ہزار کی چپت لگ گئی۔ قصور اپنا ہی تھا۔ اس لئے مصلحتاً اہلیہ محترمہ سے اس کا ذکر نہ کیا۔

وہ دن اور آج کا دن۔ میں ایسے مداحوں سے بہت گھبراتا ہوں جو تحفے تحائف لے کر مجھ سے ملنے آتے ہیں۔ یقیناً آپ اب سمجھ گئے ہوں گے کہ میں نے اپنے نئے مداح کا تربوز کس لئے واپس کر دیا۔ خیر آپ تو سمجھ دار ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ اہلیہ محترمہ کو کون سمجھائے"۔

مسٹر ڈالر

مسٹر ڈالر سے میری ملاقات ایک بین الاقوامی میلے میں ہوئی۔ اس میلے میں دنیا کے تمام بڑے بڑے ملکوں کے مداریوں، شعبدہ بازوں اور جادوگروں نے شرکت کی۔ اور اپنے اپنے کمالات دکھائے۔

سب سے پہلے ہندوستانی مداری سٹیج پر آیا۔ گاندھی ٹوپی پہنے سفید کھدر میں ملبوس۔ اس نے اپنی جواہر جیکٹ کی جیب سے ایک کوئلہ نکالا اور حاضرین کو دکھاتے ہوئے کہا: "حضرات! آپ اچھی طرح تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کوئلہ ہی ہے۔ چاکولیٹ نہیں۔ اس نے کوئلہ دائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر رکھا مٹھی بند کی اور تین دفعہ یہ منتر پڑھا۔

چل کالی کلکتے والی کرے سب کو اندھا

جب اس نے مٹھی کھولی تو لوگوں نے دیکھا کہ اس کی ہتھیلی پر کوئلے کے بجائے ایک چمکتا دمکتا ہیرا رکھا ہوا ہے۔ کسی نے اسے "کوہِ نور" سمجھا کسی نے "کوہِ طور"۔ شائقین نے اسے خریدنے کے لئے بڑی بے تابی کا اظہار کیا۔ ایک سے ایک بڑھ کر بولی دی گئی لیکن ہندوستانی مداری نے مسکراتے ہوئے اُسے اپنی جیب میں ڈال لیا اور کہا۔ "حضرات! معاف کیجئے۔ یہ اصلی نہیں نقلی ہے۔" ہندوستانی مداری تو رخصت ہوا۔ اب ایک پاکستانی جادوگر اکھاڑے میں اُترا۔ اس نے اپنی بارعب دار آواز میں نعرۂ تکبیر بلند کیا کہ سامعین ایک دفعہ تو ہل گئے۔ "حضرات میں آپ کو مشہور "رسی کا کھیل" دکھاؤنگا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے پٹ سن کی بنی ہوئی ایک رسی ہوا میں پھینکی جو معلق ہوگئی۔ اس نے ایک بار پھر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور رسی پر چڑھنے لگا۔ وہ رسی پر چڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ حاضرین انتظار کرنے لگے کہ وہ کب نیچے اترتا ہے۔ لیکن جب پندرہ بیس منٹ تک وہ نیچے اترتا نظر نہ آیا تو اسٹیج سے اعلان کیا گیا کہ وہ پاکستان پہنچ گیا۔ اس لیے اب ایرانی شعبدہ باز اپنا کرتب دکھائے گا۔ ایرانی بابا ایک عجیب انداز سے سٹیج پر نمودار ہوا اس کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا مٹکا تھا جسے اس نے اوندھا کر کے دکھایا کہ وہ خالی ہے۔ پھر مٹکے کو سیدھا کر کے اس نے سٹیج پر رکھ دیا اور نہایت پر اسرار آواز میں عمر خیام کی پہلی رباعی پڑھی۔

اُٹھ جاگ، کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے

جو مے تھی وہ سب بہہ نکلی جو جام تھا پارا پارا ہے

مشرق کا شکاری اٹھا ہے کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں

اِک ہاتھ میں قصرِ اسکندر، اِک ہاتھ میں قصرِ دارا ہے

اس کے بعد اس نے سات دفعہ "آبادان" "آبادان" کا وظیفہ پڑھا۔ حاضرین کے دیکھتے دیکھتے وہ خالی مٹکا تیل سے لبالب بھر گیا۔ تھوڑا سا تیل چھلک کر اسٹیج پر بھی بہنے لگا۔ حاضرین نے خوش ہو کر تالیاں پیٹتے ہوئے کہا "تیل! ایران کا بیش بہا تیل" کئی لوگ مٹکے کی جانب لپکے۔ مگر ایرانی بابا نے بڑی پھرتی سے مٹکا اپنے کندھوں پہ اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اسٹیج سے اتر کر چلا گیا۔

اب اسٹیج پہ ایک چینی جادوگر دکھائی دیا۔ داڑھی مونچھ صفا چٹ۔ نیلی بش شرٹ اور پتلون میں ملبوس۔ بلا کا پھرتیلا اور چاق و چوبند۔ اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا۔" ساتھیو! میں آپ کو " تبدیلیٔ ہیئت" کا مشہور و معروف کھیل دکھاؤں گا۔ آپ حضرات میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھتے رہیے۔" اس نے پنچم میں " ماؤ۔ ماؤ۔ ماؤ" کہنا شروع کیا۔ سامعین میں سے اکثر نے یہی سمجھا کہ وہ میاؤں میاؤں کی آواز نکال کر بلی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

لیکن ان کی حیرانی کی حد نہ رہی جب انھوں نے دیکھا کہ منگولین نسل کا یہ نمائندہ خالص آرین نسل کے فرد میں تبدیل ہو گیا ہے۔ اور اس کے خد و خال خطرناک حد تک روسیوں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ حاضرین کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ تبدیلی کس طرح واقع ہوئی۔ لیکن پھر بھی انھوں نے تالیاں پیٹنا اپنا فرض سمجھا۔

اب دوسرے ساحر کی باری تھی۔ ایک ہاتھ میں ہتھوڑا اور دوسرے میں درانتی پکڑے جھومتا جھامتا وہ اسٹیج پر آیا۔ چھ فٹ قد، پُر وقار چہرہ۔ مونچھوں پر ایک عجیب قسم کا تاؤ۔ بابا "استالن" کہہ کر جب اس نے درانتی ہوا میں لہرائی تو ایک دم اسٹیج پر کئی قسم کی فصلیں لہلہانے لگیں۔ گندم، کپاس، گنا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔" میاں کوئی جادو کا کھیل دکھاؤ۔ یہ کیا کہ لگے فصلیں کاشت کرنے!"

" جادو کا کھیل؟" دوسرے نے کہا۔" یہ کیا کم جادو ہے کہ میں نے بنجر اسٹیج سے گندم کپاس وغیرہ اگا کر دکھا دی۔"

" یہ تو کوئی بھی کسان کر سکتا ہے۔" کسی دوسرے نے پھبتی کسی۔

" اچھا صاحب تو دیکھیے جادو کا کھیل۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوپی ہوا میں اچھالی۔ ایک چھوٹی سی فاختہ پھر پھر کرتی، ٹوپی سے نکلی اور اسٹیج کے چکر کاٹنے لگی۔ یک لخت اسٹیج کی روشنیاں تیز ہو گئیں۔ آسمان سے پھولوں کی بارش ہونے لگی۔ اور پس منظر

میں کوئی آرکیسٹرا خود بخود مدھم سروں میں روس کا قومی ترانہ بجانے لگا۔ حاضرین نے خوش ہوکر بڑے جوش سے تالیاں بجائیں اور روسی ساحر "جے اسٹالن" کا نعرہ لگاکر سٹیج سے اتر کر چلا گیا۔

اب ایک انگریز شعبدہ باز اپنے کمالات دکھانے آیا۔ اُس نے اپنے بڑے کوٹ کی جیب سے ایک بلّی نکالی۔ دوسری جیب سے دوسری بلّی۔ تیسری جیب سے ایک بندر اور چوتھی جیب سے ترازو۔ ترازو بندر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے اُس نے سرگوشی کے انداز میں کہا "ہاں بڈیا۔ ذرا ہوشیاری سے۔"

حاضرین فوراً تاڑ گئے کہ وہ کیا کھیل دکھانے والا ہے۔ انھوں نے یک زبان ہوکر کہا "یہ تو بہت پرانا کھیل ہے۔ ہم اسے ہرگز نہیں دیکھیں گے۔"

انگریز شعبدہ باز نے مسکرا کر جواب دیا "معاف کیجئے حضرات! میرے پاس صرف یہی ایک کھیل ہے۔ اگر آپ اسے دیکھنا نہیں چاہتے تو میں معذور ہوں۔" اور وہ بلیاں بندر اور ترازو اپنی جیبوں میں ڈال کر چلا گیا۔

ازاں بعد کئی جادوگروں نے اپنے اپنے کھیل دکھائے۔ ایک پٹھان مداری نے ایک بوڑھے آدمی کی ریش سے ایک اُبلا ہوا انڈا نکالا جسے وہ سٹیج پر ہی چھیل کر کھا گیا۔ ایک مصری جادوگر نے حکم کے بادشاہ کو حکم کے غلام میں تبدیل کرکے دکھایا۔ ایک اطالوی مداری نے کیمرہ کے بغیر حاضرین کی فوٹو اتار کر رکھ دی علیٰ ہذالقیاس۔

جب سب جادوگر اور شعبدہ باز اپنے اپنے کھیل دکھا چکے تو سٹیج سے اعلان کیا گیا کہ اب جادوگروں کے بادشاہ مسٹر ڈالر تشریف لا رہے ہیں۔ حاضرین تالیاں پیٹنے لگے اور اس وقت تک پیٹتے رہے جب تک کہ مسٹر ڈالر بہ نفس نفیس سٹیج پر

تشریف نہ لے آئے۔

"حضرات! حضرات!! حضرات!!!" مسٹر ڈالر نے مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر
"میں معمولی جادوگر ہوں نہ گمنام شعبدہ باز۔ میں دراصل بیسویں صدی کا سب سے بڑا معجز
ہوں اور میں کھیل نہیں معجزے دکھاتا ہوں۔ اگر آپ مجھ سے یہ توقع کرتے ہیں کہ میں
عام مداریوں کی طرح بڑے بوڑھوں کی ہی داڑھیوں سے انڈے نکال کر دکھاؤں یا
کی بیگم کو اینٹ کی بیگم میں تبدیل کر دوں۔ تو آپ غلطی پر ہیں اور یہ میری توہین ہے نہ
میری بلکہ اس جادو یعنی میجک یعنی بلیک آرٹ کی بھی توہین ہے، جس کا باقاعدہ مطا
میں نے امریکہ کی سب سے بڑی یونیورسٹی میں متواتر سولہ سال کیا ہے۔ حضرات! جیس
کہ میں نے شروع میں عرض کیا۔ میں معجزے دکھاتا ہوں، معجزے۔ اس رعایت سے
آپ مجھے جادوگر یا معجزہ باز کہہ سکتے ہیں۔ قسم ہے ریٹا ہیورتھ کی خوبصورت ناک کی
اگر چاہوں تو بہتے پانی کو روک دوں، بحرالکاہل کو چیر کر رکھ دوں۔ کوہ ہمالہ کو دریا
مسسی سپی بنا دوں۔ لیکن حضرات! آج میں آپ کو خطرناک قسم کے معجزے نہیں
دکھاؤں گا۔ مبادا آپ ڈر کر بے ہوش ہو جائیں۔ آج کی صحبت میں چند دلچسپ معجزے
دکھانے کا ارادہ ہے۔ تو صاحبان! غور سے دیکھئے۔ شروع کرتا ہوں۔"

مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کا ایک بٹن دبایا۔ فوراً ایک چمکتا ہوا سونے کا سکہ
کھنکھناتا کر سٹیج پر گرا۔ اس کے بعد جوں جوں وہ بٹن دباتا گیا۔ سٹیج پر سکوں کا انبار لگتا
گیا۔ ایک سکہ اٹھا کر مسٹر ڈالر نے کہا "حضرات! ذرا اس سکے کو پہچانیئے۔ یہ معمولی سکہ
نہیں، جادو کا سکہ ہے۔ اس میں یہ کمال ہے کہ جب میں کسی شخص کی جیب میں ڈال دیتا
ہوں تو وہ شخص انسان نہیں رہتا، اُلّو بن جاتا ہے۔ ہاہاہا! اُلّو!"

"الو؟" حاضرین میں سے کسی نے یوں کہا جیسے اسے مسٹر ڈالر کی بات پر یقین نہ آرہا ہو۔

"جی ہاں، الو، کاٹھ کا نہیں بلکہ گوشت پوست کا اُلّو۔"

"لیکن کیسے؟" حاضرین میں سے کسی نے سوال کیا۔

"ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔" مسٹر ڈالر نے مسکرا کر کہا: "آپ حضرات میں سے کوئی تین اصحاب، چاہے وہ کسی ملک کے باشندے ہوں، سٹیج پر تشریف لے آئیں۔"

ایک ہندوستانی، ایک فرانسیسی اور ایک ایرانی سٹیج پر چلے گئے۔ مسٹر ڈالر نے تینوں کی جیبوں میں جادو کا سکہ ڈال دیا۔ اور تین دفعہ یہ منتر دہرایا۔

چل گوری واشنگٹن والی، کر دے سب کو اندھا
بچ کے جانے پائے نہ کوئی کس دے سب کا پھندا!

حاضرین کو سٹیج پر تین بڑے بڑے اُلّو بیٹھے ہوئے نظر آئے۔ مسٹر ڈالر نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "حضرات ان میں اور عام الوؤں میں یہ فرق ہے کہ ایک، عام اُلّو تو صرف رات کے وقت دیکھ سکتا ہے۔ لیکن یہ وہ الو ہیں جنہیں رات کو بھی کچھ نظر نہیں آئے گا۔" حاضرین یہ معجزہ دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔

"حضرات! حضرات حضرات!!" مسٹر ڈالر نے تین بار میز پر مکّا مار کر کہا۔ "اب دیکھئے میرا دوسرا معجزہ۔ اس کا نام ہے "بھوک کی کٹ پتلیاں۔" قسم ہے ہیڈی لامار کی خوبصورت آنکھوں کی۔ بڑا دلچسپ معجزہ ہے یہ!" مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کے متعدد بٹن دبائے۔ سٹیج پر پندرہ بیس کٹ پتلیاں نمودار ہوئیں۔ سب کی شکل و صورت یتیمانہ تھی۔ سب کے سب ہاتھ پھیلا پھیلا کر بھیک مانگ رہی تھیں۔ "حضرات!

مسٹر ڈالر نے کہا "یہ بھو کی کٹ پتلیاں ہیں۔ یہ اتنی کاہل واقع ہوئی ہیں کہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتیں۔ ازل سے روٹی کی محتاج ہیں اور شاید ابد تک رہیں گی۔ اس وقت یہ خاموش ہیں لیکن جونہی میں ان کے کشکولوں میں بسکٹ کے ٹکڑے ڈالوں گا، یہ بولنے لگیں گی۔ اور لطف یہ کہ صرف وہی الفاظ بولیں گی جو مجھے پسند ہیں۔ ذرا غور سے ملاحظہ فرمائیے اب میں ان کے کشکولوں میں بسکٹ کے ٹکڑے ڈالتا ہوں۔ ٹکڑے ڈالنے کے بعد مسٹر ڈالر نے پتلیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "دنیا کا سب سے بڑا آدمی کون ہے؟"

پتلیوں نے یک زبان ہو کر کہا "مسٹر ڈالر"

"میرے خیال میں سورج مغرب سے نکلتا ہے۔ تمھارا کیا خیال ہے"

"آپ درست فرماتے ہیں۔ سورج مغرب ہی سے نکلتا ہے"

"میری رائے میں اہرام مصر، مصر میں نہیں یونان میں ہیں۔ تم کیا کہتے ہو؟"

"جی ہاں۔ وہ یونان ہی میں ہیں"

"میں سمجھتا ہوں کہ گوتم بدھ صحرائے کالاہاری میں پیدا ہوا تھا۔ تمھاری کیا رائے ہے؟"

"بلاشبہ وہ کالاہاری ہی میں پیدا ہوا تھا"

"افلاطون فلسفی نہیں کنجڑا تھا"

"ہاں جناب بالکل کنجڑا۔ اسے فلسفی کون سرپھرا کہتا ہے"

ہاہاہا۔ ہاہا۔ مسٹر ڈالر نے ایک بلند قہقہہ فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا "دیکھا آپ نے کٹ پتلیوں کا معجزہ۔ اسے کہتے ہیں ہتھیلی پر سرسوں جمانا" مسٹر ڈالر نے اپنی بش شرٹ کے بٹن پھر دبائے۔ سب کٹ پتلیاں غائب ہوگئیں۔

"حضرات۔ حضرات" مسٹر ڈالر نے پکار کر کہا "اب تیسرا معجزہ دیکھنے کے لیئے تیار ہو جائیے۔ اس نے اپنی بش شرٹ کا سب سے قیمتی بٹن دبایا۔ سٹیج پر فوراً کہیں سے ایک بہت بڑا پٹارا آ گرا۔

"حضرات! یہ وہ جادو کا پٹارا ہے جس میں بٹھا کر میں کسی شخص کو بھی غائب کر سکتا ہوں"

ایک فرد۔ دو فرد۔ پوری قوم۔ سارا ملک! شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ ابھی ابھی آپ کے سامنے یہ معجزہ دکھایا جائے گا۔ مسٹر ڈالر نے حاضرین کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے ایک ایرانی نژاد کو اشارہ کیا کہ وہ سٹیج پر آ جائے۔ جب وہ شخص اسٹیج پر ڈرتے ڈرتے آیا۔ تو مسٹر ڈالر نے اس کا تعارف حاضرین سے کراتے ہوئے کہا "حضرات! یہ ایران کا سب سے معزز شہری ہے۔ اس کی گھر گھر پرستش ہوتی ہے۔ خاص کر عوام تو اس پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ لیکن میں اسی شخص کو پٹارے میں بٹھا کر غائب کر دوں گا۔ اور کچھ اس طرح سے کہ آپ میں سے کسی کو کیا، خود اسے بھی پتہ نہیں چلے گا کہ وہ کہاں چلا گیا۔ مسٹر ڈالر نے اس شخص کو بیٹھ جانے کے لیئے کہا۔ اس کے اوپر جادو کا پٹارا رکھا اور بلند آواز سے منتر پڑھا۔

چل گوری واشنگٹن والی، کر دے سب کو اندھا

بچ کے جانے پائے نہ کوئی، کس دے سب کا پھندا

جادو کا پٹارا اٹھایا۔ وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ہا ہا ہا۔ مسٹر ڈالر نے کہا۔ حضرات! محض ایک شخص کو غائب کرنا میرے لیئے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ قسم ہے مجھے بیٹی ڈیوس کی سڈول پنڈلیوں کی۔ میں نے بڑی بڑی قومیں، عظیم سلطنتیں اسی جادو کے پٹارے کی مدد سے آنِ واحد میں غائب کر دیں اور کسی کو آج تک معلوم نہ ہوا کہ وہ کدھر گئیں۔

لیکن حضرات میں ایک بات عرض کرنا بھول گیا۔ وہ یہ کہ پٹارا آخر پٹارا ہے۔ دوہز
صدی قبل از مسیح کی ایجاد۔ ایٹم بم کے دور میں یہ بیکار سی چیز ہے۔ حال ہی میں ڈ
نے ایک نیا طریقہ ایجاد کیا ہے جس کی مدد سے چشم زدن میں کوئی بھی چیز غائب ہو
سکتی ہے۔

حضرات اگر آپ میں سے ایسے اشخاص موجود ہوں جو زندگی سے بیزار ہیں یعنی
جو دن رات خودکشی کرنے کی نئی نئی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں تو وہ آگے آجائیں
یہ معجزہ دکھانے کے لئے مجھے ایسے اشخاص ہی کی ضرورت ہے۔ پچاس ساٹھ نوجوان
سٹیج پر چلے آئے۔ مسٹر ڈالر نے حسب معمول بش شرٹ کا بٹن دبایا۔ سٹیج پر کوئی گیند
چیز اچھل کر گری اُسے اُس نے اٹھا کر ان نوجوانوں کے درمیان رکھ دیا اور ایک با
پھر بش شرٹ کا بٹن دبایا۔ ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور سب نوجوان ریزہ ریزہ ہو کر
فضا میں تحلیل ہو گئے۔

"ہاہاہا۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے میرا نیا طریقہ!"

حاضرین اس معجز[illegible] خوفزدہ ہوئے کہ وہ تالی بجانا بھی بھول گئے
"حضرات۔ حضرات۔ حضرات!" مسٹر ڈالر نے چلاّ کر کہا "اب میں آپ کو اپنا سب
سے بڑا معجزہ دکھانے لگا ہوں۔ ذرا محتاط ہو جائیے۔ مختصراً عرض کر دوں کہ اس معجزے
کا تعلق میری اپنی ذات سے ہے۔ میجک یعنی بلیک آرٹ کی مدد سے میں اپنے آپ
کو اندھا کر لوں گا۔ مجھے کوئی چیز دکھائی نہیں دے گی۔ چاہے وہ روزِ روشن کی طرح
عیاں ہو۔"

حاضرین حیران ہو کر مسٹر ڈالر کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔ مسٹر ڈالر نے بٹن دبا کر

ایک عجیب قسم کی عینک برآمد کی اور اسے آنکھوں پر لگا لیا۔ پھر حاضرین کو یہ مژدہ سنایا: "حضرات! اب میں مکمل طور پر اندھا ہو گیا ہوں۔ آپ مجھے کوئی چیز بھی دکھائیں۔ مجھے وہ نظر نہیں آئے گی۔"

ایک ہندوستانی سٹیج پر آیا۔ اس نے تاج محل کا ایک خوبصورت ماڈل دکھاتے ہوئے مسٹر ڈالر سے کہا: "یہ کیا ہے؟"

مسٹر ڈالر نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا: "کچھ بھی نہیں۔"

ہندوستانی نے اسے ایک کتھک ناچ کی پینٹنگ دکھائی۔ "اور یہ؟"

"یہ بھی کچھ نہیں۔"

ایک روسی نے مسٹر ڈالر کے قریب آکر اسے اسٹالن کی ایک بہت بڑی تصویر دکھائی۔

"کیا اسے پہچان سکتے ہو مسٹر ڈالر؟"

"کیسے؟" مسٹر ڈالر نے حیران ہو کر جواب دیا۔ "میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔"

"اگر اتنی بڑی تصویر بھی تمھیں نظر نہیں آتی تو پھر تمھاری آنکھوں کا خدا ہی حافظ ہے۔" روسی نے تمسخر سے کہا۔

ایک چینی نے اسے اسٹیج پر آکر اپنے ملک کا نقشہ دکھایا۔ "مسٹر ڈالر بھلا بتایئے یہ کیا ہے؟"

مسٹر ڈالر نے حسب معمول سر ہلاتے ہوئے کہا: "مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔"

"کچھ بھی نظر نہیں آتا؟" چینی نے ہنس کر کہا: "عجیب مسخرے ہو۔ ابھی چند منٹ

پہلے تو بھلے چنگے تھے ابھی ہو کیا گیا۔ دیکھتے نہیں یہ چین ہے۔ پچاس کروڑ چینیوں کا وطن

"نہیں یہ کچھ بھی نہیں۔"

مسٹر ڈالر کا اور زیادہ امتحان لینا بے سود تھا۔ اس لئے حاضرین نے اتفاق رائے سے فیصلہ کیا کہ وہ واقعی اندھا ہو گیا ہے۔ اس فیصلے پر حاضرین کے بجائے مسٹر ڈالر نے تالیاں پیٹیں۔

مسٹر ڈالر نے آنکھوں پر سے عینک اتاری۔ اب اُسے ہر چیز نظر آنے لگی۔ اس نے حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"حضرات! معجزے تو میں اور بھی دکھا سکتا ہوں۔ لیکن آپ مجھ سے اتفاق کریں گے کہ اس آخری معجزے کے بعد وہ کچھ پھیکے سے لگیں گے۔ اس لئے معذرت چاہتا ہوں اور اجازت بھی۔ شب بخیر!"

مسٹر ڈالر نے آخری بار بش شرٹ کا بٹن دبایا اور اسٹیج سے غائب ہو گیا۔

تقریبوں میں شرکت

فکرِ معاش، عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

بہت خوب! لیکن شاعر تقریبوں میں شرکت کرنے کو کیوں فراموش کر گیا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ شاید اس لئے کہ فکرِ معاش وغیرہ شدید قسم کے دردِ سر ہیں اور تقریبوں میں شرکت ہلکے قسم کا دردِ سر ہے یا شاید اس لئے کہ شاعر ان خوش قسمت اشخاص میں سے تھا جنھیں دعوتی رقعے بھجوائے نہیں جاتے۔ ورنہ یہ تو ممکن نہیں کہ وہ تین قسم کے دردِ سر تو شعر میں گنوا دے اور چوتھے کا ذکر ہی نہ کرے۔

کہتے ہیں انسان سوشل قسم کا جانور ہے۔ یہ بات اکثر نہایت فخر سے دہرائی جاتی ہے حالانکہ بیچارے انسان کی بدقسمتی یہی ہے کہ وہ بہتر قسم کا جانور نہیں اور سوسائٹی میں رہتے ہوئے اس کا سوشل تقاریب سے دامن چھڑانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ آپ کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں، حیلہ جو کیوں نہ ہوں اور آپ کو تقاریب سے کتنی ہی چڑ کیوں نہ ہو آپ کو تقریبوں میں شرکت کرتے ہی بنے گی نہیں تو احباب روٹھ جائیں گے۔ رشتہ دار کہیں گے کہ آپ کا دماغ چل گیا ہے اور برادری آپ کا حقہ پانی بند کر دے گی۔ اب کس میں اتنی ہمت ہے کہ بیک وقت تین خطرے مول لے سکے اسی لئے تو ہم نے کہا نا کہ خیریت اسی میں ہے کہ تقریبوں میں شرکت کی جائے۔

فراغت کے لمحوں میں ہم نے کئی بار حساب لگا کر دیکھا ہے کہ کسی ایک تقریب میں شرکت کرنے کے کیا معنی ہوتے ہیں یعنی وہ کس بھاؤ پڑتی ہے اور ہمیشہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جو اکبرؔ الہ آبادی نے فرمایا: ع

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

بالکل غلط فرمایا، کیونکہ تقاریب اتنی مہلت ہی کب دیتی ہیں کہ آدمی ہوٹلوں کا رُخ کر سکے۔ دراصل انھیں یوں کہنا چاہیے تھا کہ عمر عزیز تقاریب میں کٹی اور مرے بھی اسی لیے کہ ایک تقریب کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری میں شریک ہوتے رہے۔

آپ ہماری ہی مثال لیجیے ہم ذرا خلوت پسند واقع ہوئے ہیں۔ یہ بات تو نہیں کہ ہم دنیا کی محفلوں سے تنگ آ گئے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ جب تک اہلِ محفل اپنے مزاج اور اپنی پسند کے نہ ہوں ایسی محفلوں سے دور رہنے ہی میں سلامتی نظر آتی ہے لیکن اس کا اب کیا کیا جائے کہ آئے دن ہمیں ایسی تقریبوں میں مدعو کیا جاتا ہے۔

جہاں چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں تو: ع

ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

ابھی چند دن ہوئے ہمارے ہمسائے کے لڑکے کا منڈن تھا۔ ہمارے ہمسائے خالص قسم کے بیوپاری آدمی ہیں۔ شعر و ادب سے انھیں دُور کا بھی واسطہ نہیں لیکن ان کا تقاضا تھا کہ ہم منڈن کے موقع پر ضرور آئیں۔ جب ان کا دعوتی کارڈ ملا اور پڑھا تو گویا ہوش اڑ گئے۔ لالہ جی نے منڈن کے لیے اتوار کا دن اور نو بجے صبح کا وقت مقرر کیا تھا۔ خدا خدا کر کے سات دنوں کے بعد اتوار کی شکل دیکھنا نصیب ہوتا ہے اور وہ بھی اگر منڈن کی نذر ہو جائے تو اتوار کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ سوچا تو یہ تھا کہ اس

اتوار کو امجد صاحب سے ملیں گے۔ کچھ سنیں سُنائیں گے۔ غپ شپ رہے گی چائے کے دو ایک دَور ہو جائیں گے اور پھر اگر موڈ اچھا ہوا تو کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد سیدھے کسی سینما ہال کا رُخ کریں گے۔ لیکن اس منڈن نے سارے پروگرام پر پانی پھیر دیا۔ بقول فلمی شاعر۔ ع

سوچا تھا کیا کیا ہو گیا

با دلِ ناخواستہ ٹھیک نو بجے لالہ جی کے گھر پہنچے۔ وہاں جا کر دیکھا ع

عجب تھی بہار اور عجب سیر تھی

یعنی لالہ جی اور ان کے تین چار ملازموں کے علاوہ اور کوئی نظر نہیں آیا۔ لالہ جی نے ہم سے مصافحہ کرتے ہوئے فرمایا "آپ ذرا جلدی آ گئے۔ خیر، کوئی بات نہیں۔ تشریف رکھئے۔"

ہم نے کہا "وقت تو نو بجے ہی تھا نا؟"

"جی ہاں! جی ہاں، لیکن آپ جانتے ہیں نو بجے کا مطلب نو بجے تو نہیں ہوتا ہے۔"

ہم نے دل میں یہی سمجھا کہ نو بجے کا مطلب شاید گیارہ بجے ہوتا ہے اور ہم وقت مقررہ سے دو گھنٹے پہلے چلے آئے ہیں۔ ہمیں ایک کرسی میں بٹھا کر لالہ جی اپنے ملازموں سے خطاب کرنے لگے۔

"ہاں تو نائی کا بندوبست ہو گیا۔

"جی ہاں۔"

"اور پنڈت جی؟"

"وہ بھی دس بجے پہنچ جائیں گے۔"

"اور لڈو؟"

"بس تیار ہی سمجھیے۔"

"لاؤڈ اسپیکر؟"

"وہ بھی آ رہا ہے۔"

کوئی ساڑھے نو پونے دس بجے مہمان آنا شروع ہوئے۔ اب جو دیکھتے ہیں تو ایک سے ایک بڑھ کر بیوپاری۔ اپنی اپنی نشست پر بیٹھتے ہی انھوں نے جو تاجرانہ قسم کی گفتگو شروع کی تو ہمارے پلے کچھ نہ پڑا کہ یہ کیا قصے ہو رہے ہیں۔ ایک بزرگ نے دوسرے بزرگ کا شانہ جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔

"تازہ رپورٹ کیا ہے؟"

اس کے جواب میں دوسرے بزرگ نے فرمایا۔

"پونے بارہ آنے" —— پونے بارہ آنے ایک اور بزرگ نے چونک کر کہا۔
"نہیں جی ساڑھے گیارہ آنے" اچھا تو پھر کیا خیال ہے آپ کا؟" کسی اور نے پوچھا۔

"اوپر جائے گا۔"

"ہاں ابھی رہنے ہی دیجیے۔"

آدھ گھنٹے کے قریب وہ اسی انداز میں پہیلیاں کہتے رہے اور خدا جانے کب تک کہتے رہتے اگر لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سنوائے جانے والے فلمی ریکارڈوں میں اُن کی آواز دب کر نہ رہ جاتی۔

دس بجے منڈن کی رسم شروع ہوئی۔ رسم کے دوران میں کئی بار محسوس ہوا کہ یہ کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گی۔ سوا گیارہ بجے پنڈت جی نے یہ مژدہ سنایا کہ منڈن

کی رسم ختم ہو چکی ہے۔ اب تین چار بھجن ہوں گے اس کے بعد بچے کو اشیرواد دی جائے گی۔ پھر لڈو تقسیم ہوں گے۔ اس کے بعد مہمان اگر چاہیں تشریف لے جا سکتے ہیں۔

ساڑھے گیارہ بجے گھر لوٹے۔ متواتر ڈھائی گھنٹے بیٹھ کر اتنے تھک گئے کہ محسوس ہُوا منڈن سے نہیں کسی لمبے سفر سے لوٹے ہیں۔ یہ تو تھی منڈن کی تقریب جسے عام طور پر نہایت ادنیٰ قسم کی تقریب کہا جاتا ہے۔ اب ایک اعلیٰ قسم کی تقریب کا بھی قصہ سن لیجئے۔ ہم آرام سے بستر پر لیٹے ہوئے تھے کہ ڈاکیہ نے ایک دعوتی کارڈ لا کر دیا۔ لکھا تھا:۔

"عزیز من!

"عزیزی منوہر کی شادی خانہ آبادی مورخہ ۲۳ جون کو مقرر ہوئی ہے۔ بارات بذریعہ لاری "اُلٹے نگر" جائے گی۔ آپ کی شرکت از حد ضروری ہے۔ لہٰذا آپ تاریخ مقررہ پر معہ عزیزان تشریف لا کر مجھے ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔ اگر آپ نہ آئے تو میں سخت ناراض ہوں گا۔"

یہ خط ہماری اہلیہ کے ماموں صاحب کا ہے اور اگر ہم ان کے ہاں نہ گئے تو وہ ناراض ہوں گے اور اہلیہ محترمہ بھی ہمیں عمر بھر معاف نہ کریں گی۔ اب اس تقریب میں شرکت کرنے کا مطلب ہے چار نہایت پریشان کن مسائل سے ٹکر لینا۔ پہلا مسئلہ تو اخراجات کا ہے۔ یعنی بیاہ کے موقع پر پہننے کے لیے دو ایک نئے سوٹ سلوائے جائیں۔ دوسرا چھٹی کا ہے۔ یعنی افسر کی منت سماجت کی جائے کہ چار پانچ دن کی چھٹی دینے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ تیسرا قیامت کی گرمی میں سفر کرنا ہے اور چوتھا مسئلہ ہے "اُلٹے نگر" جیسے فضول قصبے کی زیارت کا۔ دل ہی دل میں ماموں صاحب

کے حسنِ انتخاب کی داد دے رہے ہیں کہ لڑکے کے بیاہ کے لئے دن بھی منتخب کیا تو ۲۳ جون یعنی موسم گرما کا سب سے لمبا دن اور بارات لے جا رہے ہیں ٹانگر خیر کسی نہ کسی طرح چھٹی لے کر ان کے ہاں پہنچے۔ جون کی جھلسی ہوئی دوپہر کو بارات روانہ ہوئی۔ لاری میں پچیس آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے، لیکن بچے، جوان اور بوڑھے ملا کر چالیس کو ٹھونس دیا گیا ہے۔ گرمی سے جان نکلی جا رہی ہے خدا خدا کرکے لاری ٹانگر پہنچی۔

بارات کو ایک خستہ حال سرائے میں ٹھہرایا گیا۔ دن میں مکھیوں اور رات کو مچھروں نے ایک منٹ آرام نہ کرنے دیا۔ اس پر ستم یہ کہ "ملنی" کے موقعوں پر ماموں جان نے یہ فرمائش کر دی کہ عزیز منوہر لال کا سہرا جو انھوں نے کسی تک بند سے لکھوایا تھا مع ترنم کے ساتھ حاضرین کو پڑھ کر سنائیں۔ اب ذرا سہرے کے دو تین اشعار ملاحظہ فرمائیے کہ ترنم تو ترنم اسے کوئی ذی ہوش انسان ایسے بھی پڑھنا گوارا نہ کرے گا ؎

چاند نے دیکھ کے دولھے کو ستارے سے کہا
ہائے کس شان سے ہے باندھ کے آیا سہرا
دوڑ کر باپ نے سہرے کی بلائیں لے لیں
بھاگ کر ماں نے کلیجے سے لگایا سہرا
سالی یہ کہتی ہے ہمسائی سے گھبرا نہ بہن
دیکھ بجو کہ ابھی آیا کہ آیا سہرا

خراب گھی میں اناڑی ہاتھوں سے تلی ہوئی پوریاں، کچوریاں اور پکوان کھا کھا کر بے حال ہو گئے اور گلا بیٹھ گیا۔ ہاضمہ کچھ اس طرح بگڑا کہ بیاہ کے دس دن بعد بھی ٹھیک ہونے میں نہ آیا۔ اتنی کوفت اٹھائی اور صلہ یہ ملا۔ کہ ماموں صاحب سے

سعادتمندی اور اہلیہ محترمہ سے فرمانبرداری کا سارٹیفکٹ مل گیا۔ اب اس سارٹیفکٹ کو چاہے شہد لگا کر چاٹیے چاہے یونہی چاٹ لیجیے۔

منڈن اور شادی کی تقریبوں کے علاوہ اور درجنوں چھوٹی بڑی تقریبیں ہوتی ہیں جیسے ایک تقریب "گرہ پرویش" یعنی نئے گھر میں پہلی بار داخل ہونا اس تقریب سے زیادہ مضحکہ خیز تقریب شاید ہی کوئی ہوگی۔ آپ نے روپیہ بچاکر یا قرض لے کر ایک مکان بنا لیا۔ چلو اچھا کیا۔ اب آرام سے اس میں داخل ہو جائیے۔ آخر مکان میں داخل ہونا اور وہ بھی اپنے مکان میں کون سا ایسا مرحلہ ہے جسے آپ دوسروں کی مدد کے بغیر طے نہیں کر سکتے۔

ایک اور تقریب ہے کسی کی آمد یا روانگی کے موقع پر دوست احباب کو مدعو کرنا کسی کا کوئی عزیز افریقہ سے پندرہ برس کے بعد لوٹا اب ان کا اصرار ہے کہ سو ڈیڑھ سو حضرات ان کے دولت خانے پر تشریف لائیں اور عزیز مذکور کا خیر مقدم کریں کسی کا کوئی عزیز شنگھائی یا سنگاپور جا رہا ہے لیکن وہ تب تک نہیں جا سکتا جب تک اپنا وقت ضائع کر کے اسے الوداع نہ کہیں اور پھر دوسری تقریبیں ہیں آج ہولی ہے کل بیساکھی ہے پرسوں راکھی ہے۔ اس کے بعد ایک بزرگ کا چوتھا ہے پھر کسی اور بزرگ کی کریا ہے۔ یعنی ہفتہ کا کوئی بھی دن ایسا نہیں جب آپ اپنا پروگرام مرتب کر سکیں۔

بارہا جب متعدد دعوتی کارڈ اکٹھے ہو گئے تو جی میں آیا کہ ان سب کو معذرت کے طور پر غالب کا یہ شعر لکھ بھیجیں ۔

غالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں ۔ رویئے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

یا اس شعر کے بجائے علامہ شبلی کا وہ قطعہ بھجوا دیں جو انھوں نے اکبر الٰہ آبادی کے دعوت نامہ کے جواب میں بھجوایا تھا۔

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور رہوں میں
دل کے بہلانے کی باتیں ہیں یہ شبلی ورنہ
جیتے جی مُردہ ہوں مرحوم ہوں مغفور رہوں میں

مشاغل

کردار:-

ٹنک بند

مس فراؤن

مرزا خدرشہ

میاں شکی

حلیم

مقام:- ڈیننگ روم

ٹنک بند:- خواتین و حضرات! یہ تو ظاہر ہے کہ صبح سے پہلے گاڑی نہیں مل سکتی اور ڈیٹنگ روم میں اتنے مچھر ہیں کہ دم بھر چین نہیں لینے دیتے۔ سونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چپ چاپ بیٹھنے یا اونگھنے کی بجائے ایک دوسرے سے تعارف حاصل کیا جائے تاکہ وقت بھی کٹ جائے اور طبیعت بھی بشاش رہے۔

مس فراؤن:- تجویز تو معقول ہے۔ تو آپ ہی بسم اللہ کیجیے نا۔

ٹُنگ بند۔ خاکسار کو ٹنگ بند کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ یہ میرا نام ہے تخلص نہیں۔

مس فراڈن۔ حالانکہ تخلص بھی ہوتا۔ تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔

ٹُنگ بند۔ بجا فرماتی ہیں آپ لیکن اگر تخلص ہوتا تو پھر مجھے تک بندی کی بجائے شاعری کرنا پڑتی۔ اس لئے خدا کا شکر ہے کہ یہ تخلص نہیں۔

مس فراڈن:۔ آپ کا شغل؟

ٹنگ بند: شغل نام سے ہی ظاہر ہے۔ یعنی تُک سے تُک جوڑنا۔ دوسرے لفظوں میں قافیہ بندی۔ رات کا قافیہ برسات اور برسات کا قافیہ ملاقات سے ملاتا ہوں جبین یار کا قافیہ نرگس بیمار۔ اور موخرالذکر کا قافیہ مصر کے بازار سے جوڑتا ہوں۔ واللہ وہ لطف آتا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔

مس فراڈن: سبحان اللہ۔ آپ تو اچھے خاصے شاعر ہیں۔ حالانکہ تک بند آپ کا نام ہے تخلص نہیں۔

ٹُنگ بند: جی نہیں میں شاعر نہیں ہوں شعر کہنے کیلئے بڑا پتا مارنا پڑتا ہے اور میرا پتا ذرا کمزور ہے۔

مس فراڈن: تو آپ نثر کیوں نہیں لکھتے۔ آخر تُک بندی میں کیا دھرا ہے۔

ٹُنگ بند: اچھی نثر لکھنا بھی کون سا آسان کام ہے۔ بڑے بڑوں کو خیر و عافیت معلوم ہو جاتی ہے

مس فراڈن: لیکن سوال یہ ہے کہ تک بندی کا فائدہ؟

ٹُنگ بند: فائدہ یہ کہ جس مجلس میں کلام پڑھتا ہوں، اس میں بھگدڑ مچ جاتی ہے سامعین خدا کا شکر بجا لاتے ہیں کہ مشاعرہ ختم ہوا۔

مس فراڈن: پھر تو آپ بڑے کام کے آدمی ہیں۔

ٹنگ بند: آپ کی عنایت ہے۔ اچھا اب آپ اپنے متعلق کچھ فرمائیے۔

مس فراڈن: میرا نام مس فراڈن ہے۔

تک بند: بہت خوبصورت نام ہے۔ میری بھابھی کی بلی کا نام بھی فراؤن ہے۔

مس فراؤن: ہوگا۔ کچھ لوگ بلیوں کا نام رکھنے میں کافی حماقت کا ثبوت دیتے ہیں۔

تک بند: آپ کا شغل؟

مس فراؤن: شغل ذرا عجیب سا ہے۔ یعنی

تک بند: یعنی؟

مس فراؤن: ناک بھوں چڑھانا۔

تک بند: عجیب شغل ہے۔ ذرا اس کی وضاحت فرما دیجئے۔

مس فراؤن: میں ہر شخص اور ہر چیز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی ہوں۔ مثال کے طور

پر ان عورتوں پر جو سگرٹ نہیں پیتیں۔ ان بچوں پر جو اپنے چچا کو انکل نہیں کہتے۔

ان خواتین پر جن کی گود میں پلے کی بجائے اپنا بچہ ہوتا ہے۔

تک بند: معلوم ہوتا ہے آپ کی ناک بہت حساس واقع ہوئی ہے۔

مس فراؤن: افسوسناک حد تک حساس۔ دراصل مجھے ہر اس چیز سے بُو آنے لگتی ہے

جس پر مغرب کی مہر نہ ہو۔

تک بند: پھر تو آپ کو سورج پر بھی اعتراض ہوگا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے۔

مس فراؤن: مجھے سورج بالکل پسند نہیں۔

تک بند: مشرقی علوم و فنون بھی آپ کو ناپسند ہوں گے۔

مس فراؤن: بالکل ناپسند۔

تک بند: کالی داس۔ اجنتا اور تاج محل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

مس فراؤن: مجھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔

تک بند: آپ ایک دن میں اوسطاً کتنی بار ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔

مس فراڈن: سیکڑوں بار۔

تک بند: کافی تھک جاتی ہوں گی۔

مس فراڈن: کئی بار تو اتنا تھک جاتی ہوں کہ اپنے ناک بھوں چڑھانے کو جی چاہتا ہے۔

تک بند: اگر آپ دوسروں کی بجائے صرف اپنے ناک بھوں چڑھائیں تو زیادہ اچھا ہے۔

مس فراڈن: آپ تو مذاق کرنے لگے ...... اچھا اب ذرا ان کی باتیں بھی سنیں (تیسرے مسافر سے) آپ کی تعریف؟

مرزا خدشہ: ناچیز کو مرزا خدشہ کہتے ہیں۔

مس فراڈن: اُف کتنا خطرناک نام ہے

مرزا خدشہ: گھبرایئے نہیں میں کافی شریف آدمی ہوں۔

تک بند: کیا آپ کا شغل دریافت کر سکتا ہوں۔

مرزا خدشہ: شغل خاصہ بے ضرر ہے یعنی خطرے کی گھنٹی بجانا۔

مس فراڈن: کون سے خطرے کی؟

مرزا خدشہ: ہر قسم کے خطرے کی ...... اور آپ شاید نہیں جانتے کہ ہم بڑی خطرناک دنیا میں رہ رہے ہیں۔ یہاں قدم قدم پر خطرہ ہے آپ نے شاید چند دن ہوئے آسمان پر ایک دُم دار ستارا دیکھا ہو گا۔

مس فراڈن: ہاں ہاں دیکھا تھا۔

مرزا خدشہ: نہایت خطرناک شگون ہے۔

مس فراڈن: وہ کیسے؟

مرزا خدشہ : یہ اس بات کی علامت ہے کہ قیامت آنے والی ہے۔

مس فراڈن : آپ کو کیسے پتہ چلا کہ قیامت آنے والی ہے۔

مرزا خدشہ : دُم دار ستارہ جو طلوع ہوا ہے۔

تک بند : اس سے پہلے بھی آپ نے کبھی خطرے کی گھنٹی بجائی۔

مرزا خدشہ : کئی بار۔ تین ماہ ہوئے ہم نے کہا تھا کہ تیسری عالمگیر جنگ شروع ہونیوالی ہے۔

تک بند۔ لیکن وہ شروع نہیں ہوئی۔

مرزا خدشہ : تھوڑی ہی کسر رہ گئی۔ ورنہ شروع ہو ہی گئی تھی۔

مس فراڈن : اس کے علاوہ بھی کوئی پیشین گوئی کی؟

مرزا خدشہ : ڈیڑھ ماہ ہوا ہے۔ ہم نے کہا تھا کہ قحط پڑنے والا ہے۔

مس فراڈن : لیکن یہ پیشین گوئی بھی غلط ثابت ہوئی۔

مرزا خدشہ : اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر حالات ذرا بدتر ہو جاتے تو قحط پڑ سکتا تھا۔

تک بند : آپ کا طرزِ استدلال لاجواب ہے۔ اچھا یہ فرمایئے کہ یہ خطرے کی گھنٹی جسے آپ اکثر بجاتے رہتے ہیں۔ آپ نے کہاں رکھی ہوئی ہے۔

مرزا خدشہ : رکھنا کہاں تھی قبلہ۔ وہ تو ہمارے دماغ میں ہے۔ جی ہاں دماغ میں۔

مس فراڈن : معلوم ہوتا ہے یہ سب قصور آپ کے دماغ کا ہے۔

تک بند : مرزا صاحب کیا آپ زحمت فرما کر بتا سکتے ہیں کہ اس ویٹنگ روم کی چھت تو گرنے والی نہیں۔

مرزا خدشہ : کوئی بھی چھت کسی وقت بھی گر سکتی ہے۔ در اصل آپ کسی چھت کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کب تک کھڑی رہے گی اور کب گر پڑے گی۔

تنگ بند: (چوتھے مسافر سے) آپ کچھ فرمایئے۔

میاں شکی: نام ہے میاں شکی اور شغل ہے شک کرنا۔

مرزا خدشہ: کافی دلچسپ شغل ہے۔ تو آپ ہر وقت شک کرتے رہتے ہیں۔

میاں شکی: بجا فرمایا آپ نے۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھیں اپنے سوا کوئی شخص قابلِ اعتبار نظر نہیں آتا۔ نوکر پر شک کرتا ہوں کہ کہیں میری غیر حاضری میں گھر کا سامان اٹھا کر رفو چکر نہ ہو جائے۔ باورچی پر شک کرتا ہوں کہ کہیں کھانے میں زہر نہ ملا دے۔ گلی میں سے گذرتے ہوئے کتوں پر شک کرتا ہوں کہ کہیں سب مجھے کاٹ نہ کھائیں۔

مس فراڈن: لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں۔

میاں شکی: میں ضرورت سے زیادہ محتاط اور دانشمند واقع ہوا ہوں۔

تنگ بند: لیکن ہر شخص پر شک کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔

میاں شکی: دانشمندی کیوں نہیں۔ دیکھئے جس ہم سفر کو آپ شریف آدمی سمجھ رہے ہیں ممکن ہے وہ جیب کترا ہو۔ جس ہمسائے کو آپ پارسا سمجھتے ہیں ممکن ہے اس کی آنکھ آپ کی بیوی پر ہو۔ جس شخص کو آپ دوست تصور کرتے ہیں، ہو سکتا ہے وہ پرلے درجے کا دغا باز ہو۔

مس فراڈن: آپ کا اپنے متعلق کیا خیال ہے؟

میاں شکی: میں اپنے پر بھی اکثر شک کرتا ہوں۔ بسا اوقات مجھے شک گذرتا ہے کہ میرا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔

مس فراڈن: اس وقت تو آپ کی حالت نہایت قابلِ رحم ہوتی ہوگی۔

میاں ٹسکی: اس میں کیا شک ہے۔

مس فراڈن: (پانچویں مسافر سے) اچھا صاحب۔ آپ کافی عرصہ سے خاموش بیٹھے ہیں۔ آپ بھی کچھ فرمائیے۔

حلیم: میرا نام حلیم ہے۔

تک بند: حلیم؟ بڑا فضول سا نام ہے۔ سوائے رحیم اور کریم کے کوئی قافیہ ہی نہیں۔

مس فراڈن: آپ کا شغل؟

حلیم: معلم ہوں۔ لڑکوں کو پڑھاتا ہوں۔ بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔

مس فراڈن: یہ تو آپ کا پیشہ ہوا شغل بتائیے۔

حلیم: بس اسی کو شغل سمجھ لیجئے۔

مس فراڈن: (چمک کر) اسے آپ شغل کہتے ہیں!

حلیم: یہ شغل نہیں تو اور کیا ہے؟

تک بند: یہ شغل نہیں محض تضیع اوقات ہے

حلیم: معاف کیجئے۔ مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔

مس فرائڈن: ارے بھئی ذرا ان کے ذہن کی داد دیجئے۔ ان کے خیال میں لڑکوں کو پڑھانا اور بیوی کا پیٹ پالنا بھی شغل ہے۔

مرزا خدشہ: (قہقہہ لگا کر) ہاہاہا۔ میاں عقل کے ناخن لو۔ لڑکوں کو پڑھانا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنا بھی کوئی شغل ہے۔ ہاہاہا۔ ہاہاہا۔ بھئی حد ہو گئی ؎

دوست، رہنما، فلسفی

نام تو ان کا کچھ اور ہے لیکن محلے میں وہ چچا افلاطون کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے سن و سال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سے بہتر لقب ان کے لئے تجویز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ محلے میں ان کی حیثیت دوست رہنما اور فلسفی کی ہے۔ یعنی وہ محلے میں رہنے والے ہر شخص کے دوست ہیں چاہے وہ شخص انھیں دوست سمجھے یا نہ سمجھے۔ رہنما ہیں چاہے وہ ان پر ایمان لائے یا نہ لائے۔ فلسفی ہیں چاہے ان کی باتوں میں مغز ہو یا نہ ہو۔ دراصل چچا افلاطون اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ دوسرے لوگ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اگر پروا کرتے تو پھر وہ چچا افلاطون نہ ہوتے۔ ہماری اور آپ کی طرح "دفتر" گھسایا کرتے یا دوکان پر سودا سلف بیچا کرتے۔

چچا افلاطون کو جس وقت پتہ چلتا ہے کہ محلے میں کسی شخص پر مصیبت آنے والی ہے یا آئی ہے وہ فوراً اس کے پاس پہنچتے ہیں اور اس کو اپنے مشوروں سے فائدہ اٹھانے کا موقع بہم پہنچاتے ہیں۔ پچھلے دنوں میری نظر کمزور ہو گئی۔ آنکھوں کا معائنہ کروایا۔ ڈاکٹروں نے عینک استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ عینک بنوانے جا رہا تھا کہ راستے میں چچا افلاطون سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے کہا۔

"دماغ چل گیا ہے تمھارا۔ اس عمر میں عینک لگا رہے ہو بڑھاپے میں کیا کرو گے؟"

"بڑھاپے میں؟ ظاہر ہے کہ بڑھاپے میں بھی عینک استعمال کروں گا۔"

"میاں ہوش کی دوا کرو۔ اگر جوانی میں عینک لگاؤ گے تو بڑھاپے میں تو ضرور اندھے ہو جاؤ گے۔"

"تو بتایئے پھر کیا کروں؟"

"دیکھو عینک کا خیال ترک کر دو۔ آنکھوں میں صبح شام بادام روغن ڈالا کرو۔ اگر دو ہفتوں بعد دن کو تارے نظر نہ آنے لگیں تو چچا افلاطون نام نہیں۔"

"دن کو تارے نظر نہ بھی آئیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ رات کو نظر آجائیں تو بھی غنیمت ہے۔"

"نہیں نہیں اپنی قسم دن کو نظر آئیں گے آزمودہ نسخہ ہے۔ بس بادام روغن کے تین قطرے صبح اور تین قطرے شام۔ عینک کی ضرورت نہ رہے گی۔"

دو ملکہ چار ہفتے آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رات کے وقت جب چاند کی طرف دیکھتے تو وہ ستارہ نظر آتا تھا۔ اور جب ستاروں کی طرف دیکھتے تو مطلع بالکل صاف۔ اس کے ساتھ سر میں اس قسم کا درد کہ دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہتا۔ دوبارہ آنکھیں ٹیسٹ کرائیں۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ عینک کا نمبر پہلے کی نسبت بڑھ گیا ہے اس لیئے عینک بنوانے میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیئے۔ عینک لگوائی لیکن چچا افلاطون اس دن سے ناراض ہیں کہتے ہیں یا تو تم آنکھوں میں روغن بادام ڈالتے نہیں رہے یا پھر وہ بادام روغن گھٹیا درجے کا تھا۔

ہمارے محلے میں ایک بی۔ اے پاس بیکار نوجوان رہتے ہیں۔ چچا افلاطون کو کسی نے بتایا کہ وہ دو سال سے بیکار ہیں۔ یہ سن کر انھیں بہت افسوس ہوا۔ اسی دن نوجوان کو گھر بلا بھیجا اور کہنے لگے۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ تم اتنے عرصے سے بیکار ہو۔"

نوجوان نے عاجزی سے کہا۔ "غلطی ہوئی معاف کر دیجیے۔"

چچا افلاطون نے الماری سے ایک کتاب نکالی دو چار منٹ اس کے ورق الٹتے رہے اور پھر نوجوان سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

"دیکھو برخوردار۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیکار لوگوں کے لئے ہزاروں کام اس کتاب میں درج ہیں۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم مچھلیاں پکڑنا پسند کرو گے یا مینڈک۔"

نوجوان نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"مطلب یہ کہ اگر تم ہر روز پچاس مچھلیاں یا پچاس مینڈک پکڑ سکو تو انھیں فروخت کر کے کافی روپیہ کما سکتے ہو۔ مچھلیاں تو وہ لوگ خریدیں گے جنھیں کھانے کا شوق ہے اور مینڈک تم ان کالجوں میں فروخت کر سکتے ہو جہاں علم حیوانات پڑھایا جاتا ہے۔"

"معاف کیجئے یہ کام مجھ سے نہ ہو سکے گا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا یہ کہو۔ جنگلی بندر پکڑ لو گے؟"

"جنگلی بندر؟ یہ تو اور بھی مشکل کام ہے۔"

"اچھا اسے بھی رہنے دو۔ تمھارے لئے کوئی اور کام ڈھونڈتے ہیں۔"

چچا افلاطون نے پھر کتاب کھولی اور تھوڑے وقفے کے بعد خوشی سے چلا کر کہا "مل گیا۔ مل گیا۔"

نوجوان نے کہا "فرمایئے۔"

"تم جنگلی شہد اکٹھا کر کے فروخت کیا کرو معقول آمدنی ہو سکتی ہے۔"

نوجوان نے ڈرتے ڈرتے کہا "لیکن یہ تو ذرا ٹیڑھی کھیر ہے۔"

"ذرا بھی ٹیڑھی نہیں۔" چچا افلاطون بڑے وثوق سے بولے۔ "تم شاید شہد کی مکھیوں سے ڈرتے ہو۔ انھیں بھگانے کی ترکیب میں بتائے دیتا ہوں۔ دیکھو خوب اُبلتا ہوا پانی شہد کے چھتے پر ڈال دو۔ تمام مکھیاں چھتے سے گر کر ڈھیر ہو جائیں گی بس اطمینان سے چھتے سے شہد نچوڑ دو اور بوتل میں بھر لو۔"

چنانچہ وہ نوجوان شہد کے چھتوں کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایک جنگل میں اسے ایک بہت بڑا چھتہ نظر آیا۔ وہ درخت پر چڑھ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ چھتے پر گرم پانی انڈیلتا سینکڑوں مکھیوں نے مل کر اس پر حملہ کر دیا۔ گھبرا کر نوجوان درخت کے نیچے جو گرا تو ٹانگ ٹوٹ گئی۔ تین مہینے ہسپتال میں پڑا رہا۔ چچا افلاطون بھی حال پوچھنے گئے فرمانے لگے: "تم نے غلطی کی کہ چھتے پر گرم پانی پچکاری سے نہیں ڈالا۔ اگر پچکاری استعمال کرتے تو مکھیوں کی کیا مجال تھی کہ تمھیں کاٹتیں۔ خیر آئندہ خیال رکھنا۔"

ہمارے محلے میں ایک خاندانی رئیس بھی رہتے تھے۔ انھیں جانور پالنے کا بہت شوق ہے۔ ایک دفعہ ان کا ہرن گم ہو گیا۔ وہ بہت پریشان ہوئے کیونکہ ان کے ہاں ہرن اور ہرنی کا ایک جوڑا تھا اور ہرن کی غیر حاضری میں ہرنی کچھ اداس اداس دکھائی دیتی تھی۔ انھوں نے ہرن کی بہت تلاش کی، اخباروں میں گم شدہ ہرن کی تلاش کے عنوان سے اشتہار بھی دیا۔ ہرن ڈھونڈ کر لانے والے کے لیے انعام مقرر کیا لیکن ہرن نہ ملا۔ چچا افلاطون نے جب سنا تو وہ رئیس کے گھر پہنچے۔

"آپ کے خیال میں ہرن کے یک لخت گھر سے چلے جانے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟" انھوں نے رئیس سے پوچھا۔

"کیا معلوم۔ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"آپ نے اسے کبھی سخت سست تو نہیں کہا؟"

"میں اسے سخت سست کہتا؟ اجی حضرت! وہ تو مجھے جان سے بھی زیادہ عزیز تھا۔"

"آپ نے کبھی اسے وہ غذا کھانے پر تو مجبور نہیں کیا جو اسے ناپسند تھی۔"

"بالکل نہیں۔"

"آپ کبھی اس کے آرام میں تو خلل انداز نہیں ہوئے؟"

"مطلقاً نہیں۔"

"آپ نے کبھی اس پر یہ ظاہر تو ہونے نہیں دیا کہ اب وہ بوڑھا ہو گیا ہے۔"

"نہیں۔"

"تو پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"خدا جانے ہماری سمجھ میں تو کوئی وجہ نہیں آتی۔"

"ٹھہریئے میں بتاتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی کسی بات پر ہرنی سے رنجش ہو گئی ہے اور وہ . . . ."

"ہو سکتا ہے۔"

"ہوا یہی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ ہرنی سے روٹھ کر چلا گیا؟"

"جی ہاں۔ بالکل یہی مطلب ہے۔"

"اچھا اگر مان لیا جائے کہ آپ کا خیال صحیح ہے تو پھر . . . ."

"پھر ہرن کے واپس لانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ ۔ یعنی ۔ ۔ ۔"

"یعنی اسے منانے کے لئے ہرنی کو بھیجا جائے۔"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔"

"لیکن کہاں۔ ہرن کا کچھ اتا پتا بھی تو معلوم ہو۔"

اس کی فکر نہ کیجئے۔ یہ سب ہرنی پر چھوڑ دیجئے۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ وہ خود تلاش کرے گی۔"

رئیس پہلے تو بہت ہچکچایا۔ لیکن جب چچا افلاطون نے اسے بار بار یہ بات ذہن نشین کرادی کہ اس کا گم شدہ ہرن مل جائے گا تو وہ رضا مند ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہرن تو گم ہو ہی گیا تھا اب ہرنی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ لیکن چچا افلاطون کو اب بھی یقین ہے کہ ایک دن ہرنی ہرن کو ضرور واپس لے کر آئے گی۔

دو سال کی بات ہے کہ ایک بیوہ کے اکلوتے لڑکے کو باؤلے کتے نے کاٹ کھایا۔ محلے والے لڑکے کو ہسپتال لے جا رہے تھے۔ ادھر کہیں سے چچا افلاطون آنکلے۔ کہنے لگے۔ کیوں نازک اندام بچے کو خواہ مخواہ ہسپتال لے جاتے ہو۔ وہ لوگ ٹیکے لگا لگا کر اس کا جسم چھلنی کر دیں گے۔ اسے سخت اذیت ہوگی۔"

کسی نے پوچھا "تو پھر کیا کرنا چاہیے۔"

چچا افلاطون نے کہا "جس جگہ کتے نے کاٹا ہے اس پر دھتورے کے پتے گرم کر کے باندھ دو۔ چار یا پانچ دن تک ٹھیک ہو جائے گا۔"

چنانچہ یہی کیا گیا۔ لڑکا بظاہر تندرست ہو گیا۔ ہر شخص نے چچا کی فہم و فراست کی تعریف کی۔ لیکن چند مہینوں کے بعد وہ لڑکا خاص قسم کے پاگل پن میں مبتلا ہو گیا۔

وہ پانی سے ڈرتا۔ کتے کی طرح آوازیں نکالتا اور لوگوں کو کاٹنے کے لئے دوڑتا۔ چچا افلاطون ان دنوں بمبئی گئے ہوئے تھے۔ کسی شخص کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کیا جائے لڑکے کا بہترین علاج کیا گیا۔ لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ بمبئی سے واپس آنے کے بعد جب چچا افلاطون نے اس لڑکے کی وفات کی خبر سنی تو کہنے لگے "صرف ایک مہینہ محلے سے غیر حاضر رہا۔ اور میری عدم موجودگی میں تم سب ل کر بھی بیچارے نوجوان لڑکے کی جان نہ بچا سکے۔ مجھے تمھاری بےبسی پر ترس آتا ہے۔"

آج کل دنیا میں جب کہ ہر جگہ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ جب کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے بات چیت کرنے کی فرصت نہیں۔ چچا افلاطون کا دم غنیمت ہے۔ ہم محلے والے کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ اگر چچا افلاطون نہ ہوتے تو مصیبت کے وقت ہماری دست گیری اور رہنمائی کون کرتا۔

ادبی مشیر

قریب قریب ہر ایک خاندان میں ایک بزرگ ایسا بھی ہوتا ہے جس نے عالمِ شباب میں کسی گمنام اخبار یا رسالے میں دو ایک مضامین لکھے ہوں۔ شاید ان میں بتایا گیا تھا کہ بینگن کا بھرتہ کس طرح بنانا چاہیے۔ یا کالی کھانسی کے لئے شربتِ بنفشہ اچھا رہتا ہے یا شربتِ بادام۔ اس کے بعد وہ کچھ اس لئے نہ لکھ سکے کہ خانگی یا کاروباری دھندوں نے انھیں لکھنے کے لئے فرصت ہی کب دی۔ پھر بھی انھوں نے متعدد بار کچھ لکھنے کی ناکامیاب کوشش ضرور کی۔ مثلاً انھوں نے ایک ناول "فاختہ کا گھونسلا" لکھنا شروع کیا۔ لیکن دس صفحے لکھنے کے بعد بند کر دیا۔ ایک کتاب تنقید پر لکھنا چاہتے تھے۔ نام تھا "بال کی کھال" لیکن برا ہو کسی اور نقاد کا کہ اس نے ان سے پہلے یہ کتاب لکھ ڈالی ان کا خیال ہے کہ یہی کتاب "بات کا بتنگڑ" نام سے لکھی جائے لیکن کب؟ یہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ یہ سب تو فرصت اور فراغت پر منحصر ہے اگر کافی فرصت ملی تو ضرور لکھیں گے۔

یہ بزرگ خاندان کے ان افراد کو جنھیں ادب سے مس ہے، مشورہ دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ در اصل ان کی حیثیت دوست، رہنما اور فلسفی کی ہے۔ جونہی انھیں پتہ چلتا ہے کہ ان کے خاندان کے کسی فرد نے کچھ لکھنے کا ارادہ کیا ہے یہ اسے اپنے یہاں بلاتے ہیں یا خود اس کے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور اگر کہیں باہر گئے ہوئے ہیں تو ایک مفصل خط میں لکھنے کے متعلق تمام ضروری باتیں لکھ بھیجتے ہیں۔ ابھی پرسوں نطنی دیوی کے

نام انھوں نے ایک خط لکھا۔

ڈیر نلنی دیوی!

جیتی رہو۔ کملیش نے مجھے بتایا کہ تم گھر والوں سے چوری چھپے گیت لکھا کرتی ہو اور کبھی کبھی مشاعروں میں شرکت بھی کرتی ہو۔ لیکن تمھارے والدین کو تمھارا گیت لکھنا بالکل پسند نہیں۔ خیر انھیں میں سمجھا دوں گا۔ اول تو سمجھ جائیں گے نہ بھی سمجھیں تو تمھیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ادیب کو بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میری مثال ہی لے لو۔ میں نے اپنا پہلا مضمون بارہ برس کی عمر میں لکھا۔ عنوان تھا "شلجم کا اچار" جب یہ مضمون میری والدہ نے پڑھا تو بہت ناراض ہوئیں کہنے لگیں "اچار بنانے کا جو طریقہ تم نے لکھا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اگر کسی عورت نے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے اچار بنایا تو نہ صرف شلجم خراب ہو جائیں گے بلکہ وہ مرتبان بھی جس میں اچار بنایا جائے گا۔" میں نے ان سے کہا "یہ طریقہ میرا اپنا طریقہ ہے اس لئے میں اس کے خلاف ایک لفظ سننا نہیں چاہتا۔" ان کی نکتہ چینی کی پروا نہ کرتے ہوئے میں نے اسی دن ایک اور مضمون لکھ ڈالا۔ عنوان تھا "آنولے کا مربّہ" اس مضمون کو پڑھ کر میرے والد بہت سیخ پا ہوئے کہنے لگے "تو کچھ پڑھے لکھے گا بھی کہ اچار مربّے ہی بناتا رہے گا۔" میں نے ان کے غصے کی بھی پروا نہ کی اور برابر لکھتا گیا۔ آخر ایک دن سب کو ماننا پڑا کہ میں پیدائشی ادیب ہوں۔ تو کہنے کا مطلب یہ کہ تمھیں والدین کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم گیت اچھے

لکھو۔ اچھے گیت لکھنے کا راز یہ ہے کہ تب تک گیت نہ لکھا جائے جب تک
خوب پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا لیا جائے۔ کچھ شاعر چائے کا ایک پیالہ پینے کے
بعد گیت لکھنے لگتے ہیں۔ اس پیالے میں دودھ کے دو تین قطرے ہوتے
ہیں اور چینی بالکل نہیں ہوتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جیسی کڑوی چائے پیتے ہیں
ویسے ہی کڑوے گیت لکھتے ہیں۔ تمھارے پاس پرماتما کا دیا سب کچھ ہے
تم ایسی غلطی کبھی نہ کرنا۔ گیت لکھنے کے متعلق دوسری بات جو یاد رکھنے کے
قابل ہے یہ ہے کہ گیت ہمیشہ کسی اچھے موضوع پر لکھا جائے۔ کوئل، بلبل
یا بٹیر پر گیت لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ان پر تو ہزاروں شاعروں نے پہلے
ہی گیت لکھ دئے ہیں۔ اس لئے تمھیں کسی ایسے پرند پر گیت لکھنا چاہیے
جس پر آج تک کوئی گیت نہ لکھا گیا ہو۔ مثلاً شترمرغ۔ اب شاید تم پوچھو گی
"کیا شترمرغ بھی گیت گاتا ہے؟" ہاں ہاں کیوں نہیں گاتا۔ کونسا پرند جانور
یا انسان ترنگ میں آکر گیت نہیں گاتا۔ تیسری بات جو تمھیں کبھی نہیں بھولنا
چاہیے یہ ہے کہ گیت میں جذبات کی بجائے لَے کا ہونا زیادہ ضروری ہے
اس لئے تمھیں ایسے گیت لکھنا چاہئیں جن میں جذبات کم ہوں، لیکن جن
کی لَے پر سر دھننے کو جی چاہے۔ میرے خیال میں وہ گیت فوراً مقبول ہو
سکتا ہے جس میں جذبات بالکل نہ ہوں۔ بس لَے ہی لَے ہو۔ ایسے گیت
لکھنے کے لئے تمھیں کافی مشق کرنا پڑے گی۔ جذبات کو آہستہ آہستہ
گھٹانا یہاں تک کہ وہ بالکل نہ ہونے کے برابر رہ جائیں بڑا مشکل کام ہے
لیکن اگر شاعر ہمت نہ ہارے تو اتنا مشکل بھی نہیں۔ آخری بات جو تمھیں

یاد رکھنی چاہئے یہ ہے کہ گیت زیادہ لمبے نہیں ہونے چاہئیں۔ زیادہ سے زیادہ ان میں سات یا آٹھ سطور ہونی چاہئیں۔ چھوٹے گیتوں میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ انھیں ہر شخص پڑھ لیتا ہے۔ لمبے گیت ایک تو کافی وقت لیتے ہیں دوسرے انھیں لکھتے وقت شاعر اتنا الجھ جاتا ہے کہ گلاب کے پھول پر گیت لکھتے لکھتے گل قند پر لکھ ڈالتا ہے۔

ایک بات اور آئندہ جو بھی گیت لکھو اس کی ایک کاپی مجھے ضرور بھجواؤ تاکہ اس کو پڑھنے کے بعد میں تمھیں اپنی رائے سے مطلع کر سکوں۔

میں ہوں تمہارا خیر اندیش

ایک بزرگ

یہ بزرگ نہ صرف گیت لکھنے کا ڈھنگ بتا سکتے ہیں بلکہ ناول کس طرح لکھنا چاہیے اس کے متعلق بھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں اگر آپ کو یقین نہ آئے تو ان کا یہ خط پڑھیے جو تھوڑے دن ہوئے انھوں نے اپنے بھانجے انباش چندر کو لکھا۔

ڈیر انباش چندر!

تمھارا نیا ناول "دوج کا چاند" ریلوے بک اسٹال سے خرید کر پڑھا۔ تم سے تو یہ بھی نہ ہو سکا کہ ناول کی ایک کاپی ہی بھجوا دیتے۔ خیر کوئی بات نہیں معاف کرنا۔ تمھارا ناول مجھے بالکل پسند نہیں آیا۔ بھلا "دوج کا چاند" بھی کوئی نام ہے۔ اگر چاند ہی پر رکھنا تھا تو "چودھویں کا چاند" کیوں نہ رکھا۔ جو بات چودھویں کے چاند میں ہے وہ بھلا دوج کے چاند میں کہاں ہیروئن

کا نام تم نے "مالتی" رکھا ہے۔ "دوج کا چاند" کی ہیروئن کا نام چندر مکھی یا چاند رانی ہوتا تو مزہ آجاتا۔ ہیرو کے لیے چندر بھان کا نام بڑی آسانی سے چنا جا سکتا تھا۔ تمہارے ناول میں ہیرو اور ہیروئن میں پہلی ملاقات ساتویں باب میں ہوتی ہے حالانکہ میرے خیال میں پہلے باب میں ہو جانی چاہیئے تھی۔ بارھویں باب میں ہیرو ہیروئن سے ناراض ہو کر بیکانیر چلا جاتا ہے بیکانیر کے بجائے اگر تم اسے شملہ یا منصوری بھیج دیتے تو کتنا اچھا رہتا۔ وہاں اس کی ملاقات کسی اور لڑکی سے کرائی جا سکتی تھی۔ ملاقات نہ بھی ہوتی تو کم از کم اس کی صحت تو اچھی ہو جاتی۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ایک تندرست ہیرو ناول کے لیے کتنا ضروری ہوتا ہے۔ تمہارے ناول پر مفصل تنقید پھر کبھی کروں گا۔ اس خط میں تمہیں ایک پلاٹ بتانا چاہتا ہوں۔ اس کا استعمال تم اپنے اگلے ناول میں کر سکتے ہو۔ دراصل یہ ایک سچا واقعہ ہے اور اتنا دلچسپ کہ اگر میرے پاس وقت ہوتا تو میں خود اسے ناول کا موضوع بناتا۔

ہاں تو وہ واقعہ یہ ہے:۔

ایک بار میں کلکتے گیا۔ جس ہوٹل میں ٹھہرا وہاں میری ملاقات ایک نوجوان عورت سے ہوئی اس نے مجھے بتایا کہ اس کا خاوند گھر سے بھاگ گیا ہے اور وہ ہوٹل میں برتن صاف کر کے اپنا گذارہ کر رہی ہے۔ مجھے اس نوجوان عورت پر بہت ترس آیا۔ میں نے اس کے گمشدہ خاوند کو ڈھونڈھ لانے کا تہیہ کر لیا۔ بنگال کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن اس بھلے مانس کا پتہ نہ چلا۔ واپس کلکتے آیا۔ اور اس عورت سے پوچھا کہ اس کا خاوند اس سے

کس بات پر ناراض ہو کر گھر سے چلا گیا ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ ان کے گھر میں ایک بلی تھی جسے وہ بے حد چاہتی تھی۔ لیکن اس کے خاوند کو اس سے نفرت تھی۔ "وہ بلی اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ "وہ تو اب بھی میرے پاس ہے۔" عورت نے جواب دیا۔ "وہ بلی لاؤ۔" میں نے اس سے کہا۔ بلی لے کر میں اس شخص کی تلاش میں دوبارہ روانہ ہوا۔ ایک دن بلی کو اپنے کندھے پر بٹھا کر دہلی کے چاندنی چوک میں سے گذر رہا تھا کہ کیا دیکھتا ہوں ایک آدمی جس نے بھگوے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ بلی کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ فوراً سمجھ گیا کہ یہی وہ شخص ہے جس کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کہا "سچ بتاؤ، تم پرتوش کمار گھوش تو نہیں ہو؟" پہلے تو اس نے مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹالنا چاہا۔ لیکن جب میں نے اس کے منہ پر زور سے ایک تھپڑ مارا تو اس نے روتے روتے کہا "میں پرتوش کمار گھوش ہی ہوں۔" میں نے اس سے کہا "فوراً میرے ساتھ کلکتے واپس چلو نہیں تو ابھی پولیس کے حوالے کرتا ہوں۔" وہ میرے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔ اس نوجوان عورت نے جب اپنے خاوند کو دیکھا تو خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ میں نے اس سے کہا "بلی ہی تمہارے خاوند کو تم سے دور لے گئی اور بلی ہی اسے تمہارے نزدیک لے آئی۔"

تو یہ ہے وہ واقعہ، اسے تم اپنے دوسرے ناول کا موضوع بنا سکتے ہو۔ اس کا نام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ "ایک عورت ایک بلی"۔ اگر یہ نام پسند نہ آئے تو "بلی کا معجزہ" رکھا جا سکتا ہے۔"

تمہارا خیر اندیش
تمہارا ماموں

لیکن آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ بزرگ مزاحیہ مضامین کے بارے میں کچھ نہیں جانتے یہ بتا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مزاحیہ مضامین کے متعلق بھی ان کی واقفیت کافی ہے زیادہ مدت نہیں ہوئی انھوں نے اپنے ایک عزیز کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ پڑھا تھا۔ اِس پر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار مندرجہ ذیل خط میں کیا۔

ڈیر آنند کمار!

سدا آنند رہو۔ یہ تم نے کیا کیا کہ افسانہ لکھتے لکھتے مزاحیہ مضامین لکھنا شروع کر دیا۔ مزاحیہ مضامین لکھنا تمھارے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف وہ آدمی لکھ سکتا ہے جسے زندگی کا کافی تجربہ ہو۔ تمھاری عمر ہی کیا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ تمھیں مزاحیہ مضامین لکھنے کے لئے کم از کم تیس برس اور انتظار کرنا پڑے گا۔ میں اگر چاہوں تو کامیاب مضامین لکھ سکتا ہوں کیونکہ میری عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہے لیکن کیا کیا جائے، لکھنے کے لئے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اب میں تمھارے دو ایک مضامین کی طرف آتا ہوں۔ تمھارا ایک مضمون ہے۔ "ہم بہشت میں پہنچے۔" پہلے تو عنوان ہی غلط ہے جب تک تمھاری وفات نہ ہو جائے تم بہشت یا دوزخ میں جا کس طرح سکتے ہو۔ اور چلے بھی جاؤ تو پھر وہاں سے واپس کس طرح آ سکتے ہو۔ وہ بہشت ہی کیا جس سے لوٹ کر دنیا میں پھر آنے کو جی چاہے۔ بہشت میں تم نے جن باتوں کو نہ دیکھا اور جن کا ذکر اپنے مضمون میں کیا وہ بھی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ تم لکھتے ہو بہشت میں کوئی ہسپتال نہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے وہاں جو لوگ بیمار ہوتے ہیں وہ علاج کہاں کراتے ہیں۔ اگر تم یہ کہتے ہو

کہ بہشت میں کوئی بیمار نہیں ہوتا تو میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں کیونکہ جب کھانے پینے کو طرح طرح کی لذیذ چیزیں ملیں تو زیادہ کھا جانا قدرتی ہے۔ اور زیادہ کھا کر آدمی ضرور بیمار ہو گا۔ خاص کر جب وہ کسی قسم کی ورزش بھی نہ کرتا ہو۔ آگے چل کر تم نے لکھا ہے کہ بہشت میں زیادہ گرمی ہوتی ہے نہ سردی یعنی موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے تو یہ بات بھی عجیب ہے، کیونکہ اگر موسم ہمیشہ معتدل رہتا ہے تو گرمی کے موسم میں پیدا ہونے والے پھل اور ترکاریاں بہشت میں نہیں ہو سکتیں۔ یعنی وہاں نہ آم ہو سکتا ہے نہ کریلے۔ بھلا وہ کیسی بہشت ہوئی جہاں کوئی کام کا پھل پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ دراصل تم سے یہ غلطیاں اس لیے سرزد ہوئیں کہ تمھیں بہشت کی زندگی کا کوئی تجربہ نہیں۔

ایک اور مضمون ہے "ہم سسرال گئے"۔ مجھے یہ مضمون پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ ابھی سگائی تو تمھاری ہوئی نہیں اور سسرال کے خواب دیکھنے لگے۔ سسرال کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے وہ حقیقت سے بعید ہے۔ تم لکھتے ہو کہ تمھاری ساس کے اتنے بچے تھے کہ جب تم نے ان سے ان سب کے نام پوچھے تو وہ ایک بچے کا نام ہی بھول گئی۔ یہ بات ناممکن ہے کوئی ماں، چاہے اس کے کتنے ہی بچے ہوں ان کا نام نہیں بھول سکتی۔

اسی طرح قریب قریب ہر مضمون میں تم نے بلیشمار ٹھنیاں کھائی ہیں۔

اور پھر میں پوچھتا ہوں، اس قسم کے مضامین لکھنے کا کیا فائدہ ہے۔ تمھیں ایسے مضامین لکھنے چاہئیں جو دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید

بھی ہوں ۔ مثلاً "ہم نے دلیسی صابن کیسے تیار کیا" "ہم نے افیم کیسے چھوڑی"
"ہم نے آلو کا رائتہ کس طرح بنایا" وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مضمون میں کام
کی باتیں ہونی چاہئیں۔ صرف طنز و مزاح ہی کافی نہیں۔ امید ہے آئندہ
جب کبھی مزاحیہ مضمون لکھو گے ان باتوں کا خیال رکھو گے۔

خیر اندیش

تمہارا ایک بزرگ

ملاحظہ فرمایا آپ نے، ان بزرگ کی ادب کے بارے میں کتنی واقفیت ہے۔ سچ
پوچھئے تو ان کا دم غنیمت ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو نہ کوئی گیت لکھ سکے نہ ناول اور نہ ہی
مزاحیہ مضمون یعنی لکھنے کا سارا کام ہی رک جائے اور بیچارے ادبا مایوس ہو کر
خودکشی کر لیں ۔

بات تو سُنئے

آپ پوچھتے ہیں کہ میں گھر سے باہر کیوں نہیں نکلتا۔ گوشہ نشینی کیوں اختیار کر لی ہے۔ کیا گھر میں بیٹھے بیٹھے میری طبیعت نہیں اُوبتی؟ کیا میری صحت خراب نہیں ہو جائے گی؟ آپ بجا فرماتے ہیں۔ لیکن آپ خود ہی کہئے کہ میں گھر سے کیسے نکل سکتا ہوں۔ بدقسمتی سے ایسے محلے میں رہتا ہوں جہاں سب ریٹائرڈ لوگ رہائش پذیر ہیں۔ یوں تو قریب قریب ہر پڑھا لکھا شخص باتونی ہوتا ہے لیکن ریٹائرڈ لوگ تو گویا پیشہ ور باتونی ہوتے ہیں۔ دیکھئے میں ابھی گھر سے نکلا ہوں کہ صوبیدار صاحب نے پکار کر کہا: "اجی پروفیسر صاحب کہاں چل دئے۔ بات تو سنئے۔ آئیے آپ کا تعارف اپنے نئے کتے سے کرائیں۔" "جی ذرا ڈاک خانے تک چلا ہوں۔ ایک ضروری خط ڈالنا ہے۔" میں بڑی عاجزی سے کہتا ہوں۔ صوبیدار صاحب گرج کر فرماتے ہیں "اجی چھوڑئیے۔ خط آج کی ڈاک سے نہیں جائے گا تو کونسی قیامت آجائے گی۔ مجھے دیکھئے تین مہینے خط کا جواب لکھنے میں صرف کرتا ہوں اور تین مہینے خط ڈالنے میں۔ ادھر آئیے آپ کو ایک چیز دکھائیں۔ اور وہ چیز ہے ان کا السیشن کتا۔ ایسا خونخوار کتا دیکھ کر میرا تو خون خشک ہو رہا ہے کہ اگر کمبخت نے حملہ کر دیا تو لیکن صوبیدار صاحب ہیں کہ کتے کی تعریف میں قصیدے پر قصیدہ پڑھ رہے ہیں۔ "جناب کتے تو ہم نے کئی پالے۔ لیکن کیا بات ہے اس السیشن کی، اتنا ذہین، اتنا فرمانبردار، اتنا دلچسپ

کہ کئی دفعہ شک ہونے لگتا ہے کہ یہ کتاب ہے کہ معجزہ! آپ نے میرا کتا دیکھا تھا جس کا نام تھا پسٹل۔ اور وہ بھی دیکھا ہوگا جسے میں ایٹم کے نام سے پکارا کرتا تھا لیکن بخدا پروفیسر صاحب پسٹل اور ایٹم اس کتے کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔ اس کی ہر بات ہی الگ ہے۔ بھونکنے کو ہی لیجئے۔ ویسے تو بھونکنا ہر کتے کی عادت ہی ہے لیکن جناب جب یہ بھونکتا ہے تو معلوم ہوتا ہے۔ بھونک نہیں رہا۔ شعر پڑھ رہا ہے شعر نہیں پڑھ رہا ہے۔ . . . . درباری کا الاپ کر رہا ہے کبھی سُنئے اسے بھونکتے ہوئے۔ ایک اور وصف جو اس میں ہے۔ وہ یہ ہے . . . " قطع کلام معاف" میں ان کی بات کاٹ کر کہتا ہوں۔ " میں پھر کبھی حاضر ہوں گا۔ ڈاک کا وقت ہو رہا ہے"۔

مشکل سے پندرہ بیس گز کا فیصلہ طے کرتا ہوں کہ ماسٹر رونقی رام چلّا کر کہتے ہیں۔ " پروفیسر صاحب میں نے کہا پروفیسر صاحب"۔ ایک منٹ صرف ایک منٹ"۔ ماسٹر رونقی رام کو معمے حل کرنے کا جنون ہے۔ اس لئے جب بھی ملتے ہیں معموں کی بات کرتے ہیں۔" اچھا پروفیسر صاحب۔ اشارہ ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو زندگی کا مزا نہیں آتا۔ ممکن الفاظ ہیں بیوی اور بجلی۔ اچھا آپ کے خیال میں کون سا لفظ ٹھیک رہے گا"۔

"جی میرے خیال میں تو بجلی موزوں جواب ہے۔" "کیسے؟"

"اس طرح کہ بیوی کے گھر آتے ہی زندگی کا سارا مزہ جاتا رہتا ہے۔" "یہ تو عجیب منطق ہے۔ اچھا خیر۔ اپنا اپنا خیال ہے۔" ہاں دوسرا اشارہ ہے کہ اگر چل جائے تو بہت خوشی ہوتی ہے ممکن الفاظ ہیں۔" کھوٹی اٹھنی۔ کھوٹی چونّی"۔

"میرے خیال میں کھوٹی اٹھنی ٹھیک"۔ "کیوں؟"

"کیونکہ اگر کھوٹی چونی کی بجائے کھوٹی اٹھنی چل جائے تو زیادہ فائدہ ہے"۔

"خوب خوب یہ دلیل واقعی مضبوط ہے۔ کھونٹی اٹھی ہی لکھوں گا۔" ماسٹر رونقی رام سے جان چھڑاکر آگے چلتا ہوں کہ ڈاکٹر بانکے بہاری راستہ گھیر لیتے ہیں:" اخاہ پرونیسر صاحب، میں آپ کا ہی انتظار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے آپ اس وقت ضرور ادھر سے گذرتے ہیں۔ آیئے آپ کو تازہ افسانہ سناؤں۔ عنوان ہے" ہیضہ کا مریض" ڈاکٹر بانکے بہاری کو افسانے لکھنے کا شوق ہے۔ ویسے اگر آپ ان کے افسانے سنیں تو خدا کا شکر بجا لائیں کہ یہ ڈاکٹری کی جانب چلے گئے ورنہ افسانہ بیچارا کسی کو منہ نہ دکھا سکتا۔ اب ڈاکٹر صاحب نے اپنا طویل افسانہ پڑھنا شروع کردیا۔ یہ کوئی پچاس ساٹھ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے وہ افسانہ پڑھ رہے ہیں اور میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ابھی کتنے صفحے اور باقی ہیں۔ جی کڑا کر کے کبھی کبھی داد بھی دئیا جاتا ہوں کہ ناراض نہ ہو جائیں۔ دس صفحے سننے کے بعد بمت اور صبر جواب دے دیتے ہیں۔ اس لئے جلدی سے ان سے معذرت کرکے ان کے کمرے سے بھاگتا ہوں۔

لیجئے ابھی چند قدم ہی چل سکا ہوں کہ شری شمبھو ناتھ نے اپنی مہین آواز میں پکارتے ہوئے کہا:" میں نے کہا جی ذرا بات تو سنئے۔" شری شمبھو ناتھ ریٹائرڈ کلرک ہیں۔ ساٹھ پینسٹھ کے قریب عمر ہے۔ پانچ چھ امراض میں مبتلا رہتے ہیں۔ لیجئے انھوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنی گردن کی پشت پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ کل رات سے یہاں درد ہو رہا ہے اس کا کیا کروں؟" "کسی ڈاکٹر کو دکھایئے۔" "ڈاکٹر کو دکھایا ہے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔"

"تو کسی حکیم یا وید سے مشورہ کیجئے۔" "وید سے بھی مشورہ کیا ہے۔" "تو پھر ٹھیک ہے۔" "نہیں ٹھیک ہے۔ درد بدستور ہے۔ آپ بتایئے کہ کیا کیا جائے۔" "تیل کی مالش

کیجئے۔" "وہ تو کی ہے۔" "سینک دیجئے۔" "وہ تو دیا ہے۔" "تو پھر اس پر برف کی تھیلی رکھیے۔"

"اجی پروفیسر صاحب۔ آپ تو مذاق کرتے ہیں۔ اچھا چھوڑیئے۔ چند دنوں سے بدہضمی کی شکایت ہے۔ رات کو نیند نہیں آتی۔ آنکھیں سوج رہی ہیں۔ پیٹ پھول رہا ہے اس کا بتایئے کیا کیا جائے۔" اب آپ ہی کہئے کہ شری شمبھو ناتھ کے لئے کونسا نسخہ تجویز کیا جائے۔ اور خاص کر جب معاملہ یہ ہو کہ خاکسار پروفیسر تو ضرور ہے۔ لیکن ڈاکٹر بالکل نہیں۔" لالہ جی تو پھلا اچھا نکا کیجئے۔" میں آہستہ سے کہتا ہوں۔ اور ان سے اجازت لیتا ہوں۔ ہانپتے کانپتے ڈاک خانے پہنچتا ہوں۔ لیکن ڈاک کب کی جا چکی ہے۔ مایوس ہو کر گھر کی طرف لوٹتا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اگر واپسی پر شری شمبھو ناتھ ڈاکٹر بانکے بہاری ماسٹر روفقی رام یا صوبیدار صاحب سے تصادم ہو گیا تو آدھی رات سے پہلے گھر نہیں پہنچ سکتا ؛

دانت نکلوانا

شیکسپیئر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ شاکر سے شاکر انسان بھی دانت کا درد برداشت نہیں کرسکتا۔ اِس فقرے کی صداقت کو صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جن کو شیکسپیئر یا میری طرح کبھی دانت کا درد ہوا ہو۔ ورنہ عام انسان تو اس فقرے کو پڑھ کر بے اختیار مسکرا دیتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ شیکسپیئر یا میری طرح کبھی دانت کا درد ہوا ہو۔ ورنہ عام انسان تو اس فقرے کو پڑھ کر بے اختیار مسکرا دیتا ہے اور کہتا ہے۔ یہ شیکسپیئر بھی کتنا سادہ لوح آدمی تھا۔ اگر دانت کے درد کی بجائے قولنج کا درد۔ یا جگر کا درد لکھ دیتا تو شاید میں مان جاتا۔ مگر دانت کا درد! . . . حتےٰ کہ کسی دن اس کو اچانک رات کے گیارہ بجے دانت کا درد آدباتا ہے۔ پہلے پہلے وہ شاکر بننے اور شیکسپیئر کو جھٹلانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور دل کو یوں تسلی دیتا ہے کہ آخر غالبؔ مرحوم نے بھی تو فرمایا ہے کہ "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا" پھر خواہ مخواہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر جب دو دن کے بعد یہ درد اسے رات کو مطلقاً سونے نہیں دیتا۔ اور اس کی وجہ سے وہ گھر میں کسی اور کو مطلقاً سونے نہیں دیتا۔ تو اسے شیکسپیئر کی بات کا کچھ کچھ یقین ہونے لگتا ہے۔ اور تیسرے دن علی الصبح وہ اپنے آپ کو کسی دنداں ساز کے ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا پاتا ہے۔

بعینہٖ یہی حال پچھلے ہفتہ میرا ہوا۔ ویسے تو میں تقریباً ہر درد سے آشنا ہوں

مگر یہ معلوم نہ تھا کہ دانت کے درد میں وہ تڑپ پوشیدہ ہے کہ دردِ دل، دردِ گردہ، دردِ جگر تو اس کے مقابلے میں "عین راحت" ہیں۔ چنانچہ جب متواتر تین رات کراہنے اور ہر ہمسائے کے تجربے سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی درد میں کچھ افاقہ نہ ہوا تو میں نے ڈاکٹر اندر کمار کی دوکان کا رُخ کیا۔ آپ دانتوں کی بیماریوں کے ماہر ہیں اور دانت بجلی سے نکالتے ہیں۔ شاید موخرُ الذکر چیز نے مجھے ان کی جانب رجوع کرنے کو اکسایا کیونکہ درد اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ بجلی کے سوا شاید ہی کوئی دوسری چیز مجھے بچا سکتی۔ چنانچہ میں نے ان کی دوکان میں لپکتے ہوئے کہا: "میری بائیں داڑھ فوراً بجلی سے نکال دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب نے حیرت سے میری طرف تکتے ہوئے کہا: "آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" میں نے کہا: "آپ مجھ سے راہ و رسم بعد میں بڑھا سکتے ہیں۔ پہلے میری بائیں داڑھ نکالیے۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا: "تشریف رکھئے۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ابھی نکالے دیتا ہوں۔" اس کے بعد آپ نے مجھ پر سوالات کی بھرمار شروع کر دی۔ مثلاً کب سے درد ہے؟ کیوں درد ہے؟ اوپر والی داڑھ میں ہے یا نیچے والی داڑھ میں؟ اس سے پہلے بھی کبھی دانت نکلوایا ہے؟ کیا صرف ایک ہی دانت نکلوانا چاہتے ہیں؟

اب میں تھا کہ درد سے بیتاب ہو رہا تھا اور ہر سوال کا جواب دینے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ مگر ڈاکٹر صاحب تھے کہ برابر مسکرائے جا رہے تھے اور جب میں درد سے کراہتا تو ان کی مسکراہٹ زیادہ دلآویز اور دلکش ہو جاتی۔ آخر جب انھوں نے دو تین دفعہ میرے منع کرنے کے باوجود اچھی طرح داڑھ کو ہلایا اور دیکھا کہ شدتِ درد سے مجھ پر بیہوشی طاری ہوا چاہتی ہے تو انھیں یقین ہو گیا کہ واقعی

دانت کا درد ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اور خود تین اوزار گرم پانی میں اُبالنے لگے۔ میں نے کہا۔ "اجی حضرت جلدی کیجئے۔ بجلی سے میری داڑھ نکالئے۔" کہنے لگے۔ "آج بجلی خراب ہو گئی ہے۔ اس لئے داڑھ ہاتھ سے ہی نکالنا پڑے گی۔"

جتنا عرصہ اوزار گرم ہوتے رہے۔ وہ مجھے دانت کی خرابیوں سے پیدا ہونے والی بیماریوں پر لیکچر دیتے رہے۔ ان کے خیال کے مطابق دنیا کی تمام بیماریاں دانتوں ہی کے خراب ہو جانے سے پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ بدہضمی سے تپ دق تک جتنے امراض ہیں ان کا علاج داڑھ نکلوانا ہے۔ اس لیکچر میں آپ نے اس ملک کے لوگوں کی عادات پر بھی کچھ تبصرہ کیا۔ مثلاً "یہاں کے لوگ بے حد بے پروا واقع ہوئے ہیں۔ امریکہ اور انگلینڈ میں ہر ایک آدمی سال میں چار دفعہ دانت صاف کرواتا ہے۔ مگر یہاں لوگ اس وقت تک دندان ساز کی دوکان کا رُخ نہیں کرتے جب تک دانت کو کیڑا لگ کر سارا مسوڑہ تباہ نہ ہو جائے۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ آپ جیسے پڑھے لکھے آدمی بھی دانتوں کی ذرا پروا نہیں کرتے اگر لوگ ذرا محتاط ہوں تو آج ان کی مشکلیں حل ہو جائیں۔

اس قسم کے متعدد جملے وہ ایک ہی سانس میں کہہ گئے۔ حتیٰ کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ ہمارے ملک کے سچے خیر خواہ صرف آپ ہیں۔ اور اگر آپ نہ ہوتے تو خدا جانے ہمارے ملک کی کیا حالت ہوتی۔

جب اوزار گرم ہو چکے تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ اب انجکشن ہو گا۔ انجکشن کے نام سے مجھے روز اول ہی سے چڑ ہے۔ کیونکہ میرے خیال میں انجکشن مہذب طریقے

سے ایذا پہنچانے کا دوسرا نام ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے یقین دلایا کہ انجکشن سے کسی قسم کا درد نہیں ہوگا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی قدر مبالغہ آمیزی سے کام لے رہے تھے۔ کیونکہ انجکشن سے کافی درد ہوا۔ انجکشن کرنے کے دو تین منٹ بعد انھوں نے زنبور پکڑا۔ اور اب مجھے وہ انسان کی بجائے موت کا فرشتہ نظر آنے لگے۔ دل میں آیا کہ ہمت کر کے بھاگ نکلوں۔ میں اٹھا ہی چاہتا تھا کہ انھوں نے درازی سے کہا "میں آپ کو بارھویں دفعہ پھر یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو مطلقاً درد نہیں ہوگا۔" میں نے دبی زبان سے کہا "میں آپ کو بارھویں دفعہ یقین دلاتا ہوں کہ مجھے آپ کی بات کا یقین نہیں۔" مگر انھوں نے معاملے کو طول نہ دیتے ہوئے مجھے منھ کھولنے کو کہا۔ اور وہ داڑھ کو زنبور کی گرفت میں لائے اور مجھے محسوس ہوا کہ اب وصیت کرنے اور احباب اور اقربا کو آخری تلقین کرنے کا وقت آ پہنچا۔ انھوں نے زنبور کو جھٹکا دیا اور درد حد سے گزر کر "قضا" معلوم ہونے لگا۔ انھوں نے دوسرا جھٹکا دیا اور میں سمجھا کہ اب انھوں نے مجھے ضرور جان سے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے بعد دانت اور زنبور میں ایک باقاعدہ کشتی شروع ہوئی۔ داڑھ اپنی جگہ پر اس طرح قائم تھی جس طرح قطب مینار ہزاروں زلزلوں کے باوجود اب تک اپنی جگہ پر جما ہوا ہے مگر اس کھینچا تانی میں میں مفت میں ذبح ہو رہا تھا۔ یہ کشتی یا کشمکش کافی عرصہ تک جاری رہی اور آخر زنبور اور دانت میں تصفیہ ہوا کہ آدھی داڑھ زنبور کے منھ میں اور آدھی میرے منھ میں رہے۔ ڈاکٹر صاحب اس وقت پسینہ پسینہ ہو رہے تھے ان کی گھبراہٹ دیکھ کر قریب تھا کہ میں بھی ہوش و حواس کھو بیٹھوں کہ انھوں نے بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ فرمایا "تو بہ کتنی گہرائی میں ہے یہ داڑھ۔ بہت کوشش

کی کہ نہ ٹوٹے۔ مگر ٹوٹ ہی گئی۔"

درد سے کراہتے ہوئے میں نے کہا۔ "اب کیا ہوگا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد انھوں نے جس طرح باقی کی آدھی داڑھ نکالی۔ یہ صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھیں دانت ٹوٹنے کا سانحہ کبھی پیش آیا ہو۔ بس صرف یہ سمجھ لیجئے کہ میری وہی حالت تھی جو آپ کی ہو۔ اگر میں آپ کے بدن میں متعدد جگہوں سے لمبی لمبی سوئیاں چبھوتا جاؤں اور ساتھ ساتھ آپ کو تسلی دیتا رہوں کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی پیہم کوشش کے بعد ڈاکٹر صاحب باقی داڑھ نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔

اس عرصے میں مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کئی بار اگلے جہان پہنچا ہوں اور کئی بار وہاں سے لوٹا ہوں۔ اور پھر آخر کار میں نے اپنے آپ کو نیم بسمل کی سی حالت میں ڈاکٹر صاحب کی کرسی میں بیٹھا ہوا پایا۔ جب کچھ ہوش سنبھالا تو ایسا معلوم ہوا کہ منھ سے بے تحاشا خون بہہ رہا ہے اور ڈاکٹر صاحب ایک گلاس لے کر جس میں خون سے ملتی جلتی رنگت والی کوئی دوائی گھلی ہوئی ہے۔ کرسی کے نزدیک کھڑے ہیں۔ اس کے بعد چند ثانئے نہایت عذاب کی حالت میں گذرے۔ ڈاکٹر صاحب غرارے کرنے کو کہہ رہے تھے اور میں انھیں ایمبولنس کار کے لئے فون کرنے کو عرض کر رہا تھا اور ساتھ ہی سوچ رہا تھا کہ اسی حالت میں اٹھ کر نزدیک کے پولیس اسٹیشن میں جاکر اس سانحہ کی رپورٹ درج کراؤں تو شاید ضرورت کے وقت کام آئے۔ بارے کہیں پندرہ منٹ کے بعد خون بہنا بند ہوا۔ کچھ ڈھارس بندھی۔ مگر اب سخت درد ہونا شروع

ہوا اور میں نے بہتری اسی میں سمجھی کہ ڈاکٹر صاحب کی دوکان میں بے گور وکفن مرنے کی نسبت گھر لوٹ چلوں۔ تانگہ میں بیٹھ کر بڑی مشکل سے گھر پہنچا اور ایک گھنٹہ تک اوندھے منہ بستر میں لیٹا کراہتا رہا۔ اس کے بعد جوں جوں درد کم ہوتا گیا۔ گال سوجتا گیا۔ حتیٰ کہ دو تین گھنٹے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا میرے جسم پر کسی اور شخص کا چہرہ لگا ہوا ہے۔ اس وقت میں سمجھا کہ کیوں میرے ہموطن دندان سازکی دوکان کا آسانی سے رُخ نہیں کرتے ؛

مجھے میرے بزرگوں سے بچاؤ

میں ایک چھوٹا سا لڑکا ہوں۔ ایک بہت بڑے گھر میں رہتا ہوں۔ دراصل رہتا کہاں ہوں۔ زندگی کے دن کاٹتا ہوں۔ چونکہ سب سے چھوٹا ہوں اس لئے گھر میں سب میرے بزرگ کہلاتے ہیں۔ یہ سب مجھ سے بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ انھیں چاہے اپنی صحت کا خیال رہے نہ رہے میری صحت کا خیال ضرور ستاتا رہتا ہے۔ دادا جی کو ہی لیجیے، یہ مجھے گھر سے باہر نکلنے نہیں دیتے کیونکہ باہر گرمی یا برف پڑ رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے یا درختوں کے پتے جھڑ رہے ہیں۔ کیا معلوم کوئی پتہ میرے سر پر تڑاخ سے لگے اور میری کھوپڑی پھوٹ جائے۔ ان کے خیال میں گھر اچھا خاصا قید خانہ ہونا چاہیئے ان کا بس چلے تو ہر ایک گھر کو جس میں بچے رہتے ہیں سینٹرل جیل میں تبدیل کر کے رکھ دیں۔ فرماتے ہیں کہ بچوں کو بزرگوں کی خدمت کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وقت مجھ سے چلم بھرواتے یا پاؤں دبواتے رہتے ہیں۔

دادی جی بہت اچھی ہیں۔ پوپلا منھ۔ چہرے پر بیشمار جھرّیاں اور خیالات بیحد پرانے۔ یہ ہر وقت مجھے بھوتوں، جنوں اور چڑیلوں کی باتیں سُنا سُنا کر ڈراتی رہتی ہیں۔ "دیکھو بیٹا۔ مندر کے پاس جو پیپل ہے اس کے نیچے مت کھیلنا۔ اس کے اوپر ایک بھوت رہتا ہے۔ آج سے پچاس برس پہلے جب ابھی میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنی سہیلی کے ساتھ اس پیپل کی چھاؤں میں کھیل رہی تھی کہ یک لخت میری سہیلی

بے ہوش ہوگئی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے چیخ کر کہا: "بھوت" اور وہ پھر بے ہوش ہوگئی۔ اس طرح وہ سات دفعہ ہوش میں آئی اور سات دفعہ بیہوش ہوئی۔ اسے گھر پہنچایا گیا۔ جہاں وہ سات دن کے بعد مر گئی۔" "اور ہاں پرانی سرائے میں جو کنواں ہے اس کے نزدیک مت پھٹکنا۔ اس میں ایک چڑیل رہتی ہے۔ وہ بچوں کا کلیجہ نکال کر کھا جاتی ہے۔ اس چڑیل کی یہی خوراک ہے۔"

پتا جی کا تکیہ کلام ہے "نالائق" ایک اور تکیہ کلام ہے: "جب میں طالبِ علم تھا" وہ جب بھی مجھ سے گفتگو کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے ایک تکیہ کلام کا ضرور استعمال کرتے ہیں۔

"آج کتنے سوال نکالے؟"

"جی دس۔"

"صرف دس۔ نالائق۔"

"آج تاریخ کے کتنے صفحے پڑھے؟"

"جی بیس۔"

"نالائق۔ جب میں طالب علم تھا۔ پچاس صفحے پڑھا کرتا تھا۔"

"اکبر کون تھا؟"

"جی ایک بادشاہ تھا۔"

"نالائق۔ کہو ایک اچھا بادشاہ تھا۔"

"امتحان میں کیسے رہے۔"

"جی جماعت میں تیسرا رہا ہوں۔"

"نالائق۔ جب میں طالب علم تھا۔ ہمیشہ اوّل آیا کرتا تھا۔"

"آج کتنی روٹیاں کھائی ہیں۔"

"جی تین۔"

"نالائق۔ جب میں طالب علم تھا۔ دس روٹیاں کھایا کرتا تھا۔"

ماتاجی کو ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ پرماتما نہ کرے اگر مجھے کچھ ہو گیا تو پھر کیا ہوگا۔ وہ مجھے تالاب میں تیرنے کے لئے اس لیئے نہیں جانے دیتیں کہ اگر میں ڈوب گیا تو؟ آتشبازی کے اناروں۔ پٹاخوں اور پھلجھڑیوں سے اس لیئے کھیلنے نہیں دیتیں کہ اگر میرے کپڑوں میں آگ لگ گئی تو؟ خالی پستول کو ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دیتیں کہ اگر یہ چل گیا تو؟ پچھلے دنوں میں کرکٹ کھیلنا چاہتا تھا۔ ماتاجی کو پتہ لگ گیا کہنے لگیں "کرکٹ مت کھیلنا۔ بڑا خطرناک کھیل ہے۔ پرماتما نہ کرے اگر گیند آنکھ پہ لگ گئی تو؟"

بڑے بھائی صاحب کا خیال ہے کہ جو چیز بڑوں کے لیئے بے ضرر ہے چھوٹوں کے لیئے سخت مضر ہے۔ خود چوبیس گھنٹے پان کھاتے ہیں۔ لیکن اگر مجھے کبھی پان کھاتے ہوئے دیکھ لیں تو فوراً ناک بھوں چڑھا کر کہیں گے "پان نہیں کھانا چاہئے۔ بہت گندی عادت ہے۔" سینما دیکھنے کے بہت شوقین ہیں۔ لیکن میں اگر ساتھ جانے پر اصرار کروں تو کہیں گے۔ "چھوٹوں کو فلمیں نہیں دیکھنا چاہئیں۔ اخلاق پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔"

اسی طرح چھوٹوں کو عطر نہیں لگانا چاہیئے تاکہ ان کے کپڑوں سے خوشبو نہ آئے۔ نظمیں نہیں لکھنا چاہئیں تاکہ وہ بڑے ہو کر شاعر نہ بن جائیں۔ ہنسنا نہیں چاہیئے

تاکہ وہ ہمیشہ اداس رہیں۔

اب رہیں ہماری بھابی۔ انھیں افسانے لکھنے اور جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے۔ ان کا تکیہ کلام ہے "لپک کے جائیو"۔ جب بھی میں کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹتا ہوں وہ کہتی ہیں "لپک کے جائیو اور دل پسند بک اسٹال سے رسالہ "سورج مکھی" کا تازہ نمبر لے آئیو۔" اگر "سورج مکھی" نہ ملے تو "چندر مکھی" لے آنا۔ اگر وہ بھی نہ آیا ہو تو "تارا مکھی" اور ہاں پوچھتے آنا کہ "چالاک چور" کا دوسرا حصہ چھپ کر آگیا یا نہیں۔ اور پھر "نیلا ڈاکو" کب تک چھپ رہا ہے"۔ سارا دن ایک بک اسٹال سے دوسرے بک اسٹال تک مارا مارا پھرتا ہوں۔ کبھی "نقاب پوش" حصہ اول کی تلاش میں، کبھی "پراسرار قلعہ حصہ دوم" کی کھوج میں۔

بڑی بہن کو گانے بجانے کا شوق ہے۔ ان کی فرمائشیں اس قسم کی ہوتی ہیں۔ "ہارمونیم پھر خراب ہوگیا ہے اسے ٹھیک کرالاؤ۔ ستار کے دو تار ٹوٹ گئے ہیں اسے "میوزیکل ہاؤس" لے جاؤ۔ طبلہ بڑی خوفناک آوازیں نکالنے لگا ہے اسے فلاں دکان پر چھوڑ آؤ۔" جب انھیں کوئی کام لینا ہو تو بڑی میٹھی بن جاتی ہیں۔ کام نہ ہو تو کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ خاص کر جب ان کی سہیلیاں آتی ہیں اور وہ طرح طرح کی فضول باتیں بناتی ہیں اس وقت میں انھیں زہر لگنے لگتا ہوں۔

لے دے کے سارے گھر میں ایک غم گسار ہے اور وہ ہے میرا کتا "موتی"۔ بڑا شریف جانور ہے۔ وہ نہ بھوتوں اور چڑیلوں کے قصے سنا کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ مجھے نالائق کہہ کر میری حوصلہ شکنی کرتا ہے اور نہ اُسے جاسوسی ناول پڑھنے کا شوق ہے نہ ستار بجانے کا۔ بس ذرا موج میں آئے تو تھوڑا سا

بھونک لیتا ہے۔ جب اپنے بزرگوں سے تنگ آجاتا ہوں تو اسے ساتھ لے کر جنگل میں نکل جاتا ہوں۔ وہاں ہم دونوں تیتریوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ گلہریوں کا تعاقب کرتے ہیں۔ چشمے میں ناچتی ہوئی مچھلیوں کو دیکھتے ہیں۔ دادا جی اور دادی جی سے دُور۔ پتا جی اور ماتا جی سے دور۔ بھائی اور بہن کی دسترس سے دُور۔ اور کبھی کبھی کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں موتی کے ساتھ سستاتے ہوئے میں سوچنے لگتا ہوں "کاش میرے بزرگ سمجھ سکتے کہ میں بھی اِنسان ہوں۔ یا کاش وہ اتنی جلدی بھول نہ جاتے کہ وہ کبھی میری طرح ایک چھوٹا سا لڑکا ہوا کرتے تھے!"

جانا حاتم طائی کا اسنوبین کی تلاش میں

حاتم طائی جب اپنے ساتویں سفر سے گھر لوٹا تو مسز حاتم طائی اسے دیکھ کر پہلے تو ہنسی اور پھر رونے لگی۔ یہ ماجرا دیکھ کر حاتم طائی بہت حیران ہوا اور اپنی اہلیہ کو مخاطب کر کے کہنے لگا "اے نیک بخت! سچ سچ بتا۔ دل کی بات زبان پر لا کہ تو مجھے دیکھ کر ہنسی کس لئے اور روئی کیوں؟" مسز حاتم طائی نے جواب میں کہا "ہنسی تو اس لئے کہ اتنی مدت کے بعد تمھاری شکل دیکھنا نصیب ہوئی اور روئی اس لئے کہ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تم ایک دن میرے پاس نہیں رہے ہمیشہ اغیار کی خاطر جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے رہے" حاتم نے جب بیوی کی یہ شکایت سنی تو پہلے تو خوب کھل کر ہنسا اور پھر یک لخت سنجیدہ ہو گیا "اے نیک بخت!" حاتم نے روٹھی رانی کو مناتے ہوئے کہا "کیا تجھے معلوم نہیں کہ کامیاب ازدواجی زندگی کا راز اس میں ہے کہ جہاں تک ممکن ہو خاوند اور بیوی ایک دوسرے سے دور رہیں۔ نہیں تو نوبت گالی گلوچ اور لڑائی جھگڑے سے ہوتی ہوئی طلاق تک پہنچتی ہے۔ رہا تمھارا یہ وہم کہ میں ہمیشہ اپنوں کی بجائے دوسروں کے کام آیا ہوں تو اس ضمن میں ایک شعر سن اور ہو سکے تو اسے سمجھنے کی کوشش کر۔ وہ شعر ہے ؎

پہلے تو فنا کا درجہ ہے اور بعد بقا بھی ملتی ہے

وہ جینے کا نام نہ لے جو مرنے کو تیار نہیں

مسز حاتم نے شعر سن کر برجستہ کہا: "سبحان اللہ! آفرین ہے تم پر اگر یہ شعر تمہارا ہے، اور اگر کسی اور کا ہے پھر بھی تم پر آفرین کہ شاعر نے ضرور تمہیں دھیان میں رکھ کر یہ شعر کہا ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم کب تک دوسروں کی خاطر یونہی فنا ہوتے رہو گے؟ میرا تو خیال ہے کہ عمر عزیز کا کافی حصہ برباد کر چکے ہو۔ عاقبت کا خیال چھوڑ دو اور دنیا کی فکر کرو۔"

حاتم طائی نے مسکرا کر کہا: "یہ ناممکن ہے۔ میرے پاؤں میں ازل سے چکر ہے اور ابد تک رہے گا۔ میں اب اپنی زندگی کی سب سے کڑی مہم پر روانہ ہونے والا ہوں۔"

"یہ آٹھواں سفر کس سلسلے میں ہے؟"

"اسنومین کی تلاش میں!"

"اسنومین! وہ کیا بلا ہے؟"

"اے نیک بخت اسنومین بلا نہیں۔ ہماری تمہاری طرح گوشت پوست کا انسان ہے۔ فرق اس میں اور ہم سب میں صرف اتنا ہے کہ وہ اینٹ اور سیمنٹ کے مکانوں کی بجائے ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر قیام کرتا ہے۔"

"تم اس کی تلاش میں کس لئے جانا چاہتے ہو؟"

"یہ ایک سب ایڈیٹر (SUB EDITOR) کی ملازمت کا سوال ہے۔ اس کے باس (BOSS) نے اسے اخبار کے سالنامے میں ایک مضمون اسنومین پر لکھنے کیلئے کہا ہے۔ اگر اس نے یہ مضمون نہ لکھا تو اسے ملازمت سے برطرف کر دیا جائے گا اس بدنصیب کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں اگر اسے جواب مل گیا تو یقیناً وہ سب فاقوں سے مریں گے۔ اچھا اب خدا حافظ، کہ وقت قلیل اور راستہ طویل ہے۔"

اتنا کہنے کے بعد حاتم طائی اللہ کا نام لے کر اسنومین کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔

کھیتوں مرغزاروں سے گذرتا جنگلوں اور بیابانوں کی خاک چھانتا وہ یک صحرائے لق ودق میں پہنچا۔ جہاں اس کی ملاقات ایسے اشخاص سے ہوئی جنھوں نے اپنے چہروں پر آہنی خول چڑھا رکھے تھے اور جن کے آگے آس پاس عجیب وغریب آلات اور مشینیں بکھری پڑی تھیں۔ حاتم طائی یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے ان کے قریب جاکر کہا "اے صاحبو! یہ کیا مذاق ہے۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو۔ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

ان میں سے ایک نے جواب میں کہا "اے نو وارد! تھیں یقین آئے یا نہ آئے، ہم آدم زاد ہیں اور ایک نئے بم کو چلانے کا تجربہ کرنے کے لئے اس صحرا میں آئے ہیں"۔
حاتم طائی نے لاحول پڑھتے ہوئے کہا "صاحبو! میری مانو تو اس حماقت سے باز آؤ اور واپس اپنے ملک چلے جاؤ۔ نئے بم بنانے اور چلانے سے یہ کہیں بہتر ہے کہ انسان کسی کی بگڑی بنائے اور جہاں اچھی بات رُک گئی ہو وہاں سے اس کو آگے چلائے"۔

"معلوم ہوتا ہے کہ فلسفی ہو یا سرپھرے۔ ورنہ ایسی بہکی بہکی باتیں نہ کرتے"۔

"خاموش! تم شاید نہیں جانتے کہ میرا نام حاتم اور پیشہ خدمتِ خلق ہے"۔

"تو جاؤ خدمتِ خلق کرو۔ ہم سے خواہ مخواہ کیوں اُلجھ رہے ہو؟"

حاتم نے اس شخص کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے ایک شعر پڑھا اور وہاں سے آگے چلا۔ متواتر سات دن اور سات راتیں چلنے کے بعد وہ ایک شہر میں پہنچا۔ رات ایک ہوٹل میں بسر کرنے کا ارادہ کیا۔ ہوٹل کے ایک بیرے نے اسے بتایا کہ رات کے وقت ایک اُڑن طشتری شہر کے اوپر پرواز کرتی ہے کہ جس کی ہیئت اور رفتار دیکھ کر بچے چیخنے لگتے ہیں اور بزرگ لحافوں میں گھس جاتے ہیں۔ حاکم شہر نے دس ہزار روپے

کا انعام اس شخص کو دیا منظور کیا ہے جو اس اڑن طشتری کا پتہ چلائے۔ حاتم نے پورے وثوق سے کہا "میں اس طشتری کا راز طشت از بام کر سکتا ہوں۔" چنانچہ اسی رات ایک ہوائی جہاز میں بیٹھ کر حاتم اڑن طشتری کی کھوج لگانے کے لیے روانہ ہوا۔ کافی عرصہ فضا میں چکر کاٹنے کے بعد حاتم کو ایک چمکتی اور اڑتی ہوئی چیز نظر آئی۔ اس نے ہوائی جہاز کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ متواتر دو گھنٹے کے تعاقب کے بعد حاتم کو پتہ چلا کہ وہ چاند کا تعاقب کر تا رہا ہے۔ حاتم کو اپنی غلطی پر بہت افسوس ہوا کہ خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔ وہ مایوس ہو کر لوٹنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دفعتاً کوئی چیز اس کے جہاز میں گری۔ حاتم نے غور سے دیکھا۔ وہ ایک چکور تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اڑتے اڑتے تھک گیا ہے۔ حاتم نے چکور کو اپنے بڑے کوٹ کی جیب میں ڈالا اور نیچے اترا۔ دوسرے دن اس نے حاکمِ شہر کی خدمت میں چکور پیش کرتے ہوئے کہا "عالی جاہ! جسے آپ غلطی سے اڑن طشتری سمجھتے رہے ہیں وہ دراصل چکور ہے کہ روزِ ازل سے چاند کا عاشق ہے۔" دس ہزار روپے اور دو سنہری تمغے انعام میں پائے اور وہاں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔

چلتے چلتے حاتم کوہِ ہمالیہ کی ترائی میں پہنچا۔ رات ایک درخت پر بیٹھ کر کاٹی۔ صبح اس کی ملاقات ایک شرپا سے ہوئی۔ شرپا نے حاتم طائی کو سمجھاتے ہوئے کہا "اسنومین کی تلاش بے سود ہے۔ اس کا مقام ہمالیہ کی ان چوٹیوں پر ہے جہاں انسان کی رسائی ناممکن ہے۔ تم اس جستجو سے باز آؤ اور واپس گھر چلے جاؤ۔"

"لیکن شرپا بہادر یہ ایک سب ایڈیٹر کی ملازمت کا سوال ہے۔ اگر اس نے اسنومین پر مضمون نہ لکھا تو . . . ."

"کچھ بھی ہو اسنو مین کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔"

حاتم طائی نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ شرپا بہادر کو دس ہزار روپے کی تھیلی پیش کر دی۔ شرپا نے مسکرا کر کہا۔ "میں تمھاری مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

حاتم طائی اور شرپا نے تین کیمپ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پہلا دس ہزار فٹ، دوسرا بیس ہزار فٹ اور تیسرا پچیس ہزار فٹ کی بلندی پر۔ انھوں نے آکسیجن سلنڈر، وائرلیس سیٹ، برف کو کاٹ کر راستہ بنانے کے کلہاڑے وغیرہ خریدے اور ایک دن دوسرے کیمپ میں آرام کرنے کے بعد وہ تیسرے کی طرف روانہ ہوئے۔ ابھی مشکل سے ایک ہزار فٹ کا فاصلہ طے کر پائے تھے کہ طوفان میں گھر گئے۔ برف پڑنے لگی، سرد ہوا کے تیز اور تند جھونکوں نے اوسان خطا کر دیئے۔ خون منجمد ہونے لگا۔ حاتم نے طوفان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "اے قہر ہمالیہ! تو کیوں خواہ مخواہ ہم سے جنگ کرتا ہے اور ہمارا قافیہ تنگ کرتا ہے۔"

شرپا نے ازراہِ مذاق حاتم سے کہا۔ "اے حاتم! یہ طوفان تمھارا قافیہ کیا تنگ کرے گا۔ تمھارا قافیہ تو پہلے ہی تنگ ہے کہ سوائے ماتم کے حاتم کا کوئی قافیہ ہی نہیں۔ تم نے غلطی یہ کی کہ موسم کی جانچ پڑتال کرنے والوں کی پیش گوئی پر یقین نہ کیا اور سوچے سمجھے بغیر دوسرے کیمپ سے چل نکلے۔"

ایک گھنٹے کے بعد طوفان تھما۔ حاتم اور شرپا تیسرے کیمپ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

دوسرے دن حاتم نے وائرلیس پر یہ اعلان سنا کہ تین دن کے لئے موسم خوشگوار رہے گا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور شرپا کو ساتھ لے کر اسنو مین

کی تلاش میں نکلا۔ چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ ہر طرف برف ہی برف نظر آتی تھی۔ چرند پرند آدم زاد، پری زاد کا کوسوں تک نشان نہ تھا۔ انھوں نے جنگل کا کونہ کونہ چھان مارا۔ لیکن اس بھلے مانس یا بن مانس کا کہیں پتہ نہ ملا۔ آخر تھک ہار کر شریا نے کہا۔

"اے حاتم ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے چارا اسنومین اللہ کو پیارا ہو گیا۔"

"تو پھر؟"

"ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ اگر زیادہ عرصہ یہاں ٹھہرے تو ہم بھی اللہ کو پیارے ہو جائیں گے۔"

"لیکن اس سب ایڈیٹر کا کیا ہو گا؟"

"زیادہ سے زیادہ اسے ملازمت سے جواب مل جائے گا۔"

"جناب! تم بڑے بے رحم ہو۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس کمبخت کی ایک بیوی اور سات بچے ہیں۔"

"میں اپنی سات بیویوں اور ایک بچے کے متعلق سوچ رہا ہوں۔"

"تم بڑے خود غرض ہو؟"

"آخر تم چاہتے کیا ہو؟"

"تلاش جاری رکھی جائے۔"

دوسرے دن حاتم اور شریا نے برف پر کسی عجیب و غریب جانور کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔ حاتم نے خوشی سے چلا کر کہا۔ "مل گیا۔ مل گیا۔"

شریا نے پوچھا "کیا؟" حاتم نے جواب دیا۔ "اسنومین کا سراغ۔"

دونوں ان نشانات کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک غار کے قریب پہنچے۔ حاتم

نے غار کے سامنے کھڑے ہو کر کہا: "اے عجیب و غریب مخلوق! اپنے مسکن سے باہر نکل کر دیکھ کہ تجھے کون ملنے آیا ہے۔ خدا کے لئے اب زیادہ انتظار مت دکھا اور جلدی سے غار سے باہر آ۔"

غار میں سے کوئی جواب نہ آیا۔ حاتم نے ایک بڑا سا پتھر لے کر غار کی طرف پھینکا۔ ایک خوفناک قسم کا جانور کہ جو ریچھ اور گینڈے کا مرکب معلوم ہوتا تھا۔ غراتا ہوا باہر نکلا اور حاتم اور شرپا کا تعاقب کرنے لگا۔ دونوں سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے اور کیمپ میں جا کر دم لیا۔

تیسرے دن ناشتہ کرنے کے بعد حاتم نے آبدیدہ ہو کر کہا: "معلوم ہوتا ہے کہ اس مہم میں ناکامی کا منھ دیکھنا پڑے گا۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ میری پہلی شکست ہو گی۔"

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ مالک کارساز ہے۔"

"کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"ایک تدبیر میری سمجھ میں آتی ہے۔"

"کہو۔"

"میری رائے میں شراب انسان کی چاہے وہ اسنو مین ہی کیوں نہ ہو پہلی اور آخری کمزوری ہے اگر ہم جگہ جگہ شراب کی بوتلیں رکھ دیں تو کام بن سکتا ہے۔"

"تجویز تو خاصی معقول ہے۔"

اس دوپہر کو حاتم اور شرپا نے جنگل میں مختلف جگہوں پر شراب کی بوتلیں رکھ دیں۔ شام کے وقت جب وہ چہل قدمی کرنے کو نکلے تو انھوں نے دور سے دیکھا کہ

ایک لنگور نما انسان بوتل کو منہ سے لگا کر حلق میں شراب انڈیل رہا ہے۔ حاتم کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اور شہزادہ بھاگم بھاگ اس شخص کے پاس گئے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ اسے مخاطب کرتے اس نے بڑے تپاک سے کہا: "ہیلو حاتم طائی! تم یہاں کیسے؟"

حاتم طائی نے حیران ہوتے ہوئے جواب دیا: "ہیلو اسنومین! تو گویا تم مجھے جانتے ہو۔"

اس شخص نے قہقہہ لگا کر کہا: "نہ صرف یہ کہ تم بھی مجھے اچھی طرح جانتے ہو۔ میں ایس۔ ایچ سبھراکا نیم ہوں۔ اخبار "ہسٹارک ٹائمز" کا سب ایڈیٹر"

"لیکن یہ حلیہ تم نے کیا بنا رکھا ہے۔"

"تمھارا اشارہ شاید لنگور کی کھال کی طرف ہے جو میں نے پہن رکھی ہے۔ یہ جتن تو اسنومین کو دھوکا دینے کے لئے کیا گیا ہے۔ اسنومین انسان سے بدکتا ہے اس لئے میں لنگور کی کھال پہن کر اس کی تلاش میں نکلا ہوں کہ کہتے ہیں۔ ع

کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

"اچھا تو تم بھی اسنومین کی تلاش کر رہے ہو؟"

"ہاں! بات دراصل یہ ہوئی کہ جب دو مہینے انتظار کرنے کے بعد تمھاری کوئی خبر نہ ملی تو میں نے سوچا کہ خود ہی چل کر اسنومین کا سراغ لگایا جائے۔"

"تو کچھ پتہ چلا؟"

"ابھی تک تو کچھ سراغ نہیں ملا۔"

"تو پھر؟"

"ملازمت سے جواب مل جانا یقینی ہے۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوگا۔"

"کیا کیا جائے کوئی چارہ نہیں۔"

اس اثنا میں شریا بالکل خاموش کھڑا رہا۔ یک لخت اس نے شری ایس ایچ سہرا منیم اور حاتم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" اے صاحبو! میری مانو تو کام اب بھی بن سکتا ہے۔"

حاتم نے پوچھا: "کیسے؟"

شریا بولا: "لنگور کے بھیس میں شری ایس ایچ سہرا منیم اچھے خاصے اسنومین نظر آتے ہیں کیوں نہ اس لباس میں ان کی چند تصاویر لی جائیں اور انھیں اسنومین کے روپ میں پیش کیا جائے۔ رہے پنجوں کے نشانات وہ کسی بھی جنگلی جانور کے لیے جا سکتے ہیں۔"

"وہ مارا!" حاتم نے خوشی سے ناچتے ہوئے کہا۔

"آفرین!" شری ایس ایچ سہرا منیم نے نعرہ لگایا۔

چنانچہ لنگور کے بھیس میں شری ایس ایچ سہرا منیم کی متعدد تصویریں کھینچی گئیں۔ ایک عجیب و غریب جنگلی جانور کے پنجوں کے نشانات کی فوٹو لی گئی اور تینوں خوشی خوشی اپنے اپنے گھر واپس آئے۔

چندا رے!

کردار:-

پروفیسر راکیش
بھولا ، پروفیسر راکیش کا نوکر
چندا : فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کی سیکریٹری
نیلا امبر اور آکاش : پروفیسر راکیش کے دو بے تکلف دوست

مقام:-

پروفیسر راکیش کا ڈرائنگ روم

پروفیسر راکیش : (ایک کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے) آہا ! کتنا دلچسپ مجموعہ ہے!
اور پھر نام کتنا پیارا ہے "چندا رے!" لطف یہ کہ یہ سب گیت چندا پر لکھے
گئے ہیں ۔

چندا رے تو روتا کیوں ہے؟
چندا رے تو کیوں مسکائے ؟ چندا رے کب صبح نہ ہو گی ؟
چندا رے تو کیوں شرمائے ؟ چندا رے تو کیوں چندا رے ؟
یہ فلمی شاعر بھی کمال کرتے ہیں ۔ بھلا کیا سوال کیا ہے ع چندا رے تو کیوں

چندا رے! اب بھلا بے چارا چندا اس سوال کا کیا جواب دے گا۔ اور پھر یہ گیت ؎ چندا رے او ظالم چندا۔ (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) بھولا۔ ارے بھولا۔

بھولا: جی سرکار۔

راکیش: ذرا ادھر آؤ۔

بھولا: (قریب آتے ہوئے) جی سرکار۔

راکیش: بھولا۔ کیا تم جانتے ہو کہ چندا کیوں ظالم چندا ہے۔

بھولا: سرکار اپنے دھندے سے فرصت ہی کتنی ملتی ہے کہ بندہ یہ سوچے کہ چندا کیوں ظالم چندا ہے۔

راکیش: تم ایک دم ڈل (Dull) ہو بھولا۔ ایک دم ڈل۔ فلمی گیت سمجھانا تمھارے بس کا روگ نہیں۔ اچھا تم جاؤ۔ ہم سوچتے ہیں آج کالج سے چھٹی ہے.... ہاں بازار سے دوڑ کر سگریٹ لے آؤ۔

بھولا: بہت اچھا سرکار۔ (جاتا ہے)

راکیش: ہم۔ چندا رے او ظالم چندا۔ شاید چندا اس لئے ظالم ہے کہ وہ سورج نہیں ہے یا شاید اس لئے کہ وہ شاعر کو ظالم نظر آتا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ چندا اس لئے ظالم ہے کہ شاعر کا محبوب اس سے روٹھ گیا ہے اور اسے اس کی یاد ستا رہی ہے۔ ہُم۔ لیکن یہ بات کیا بنی۔ ؏ چندا رے او ظالم چندا۔

(کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

راکیش: کون؟

آواز: جی میں ہوں چندا۔

راکیش: (حیرانی سے) چندا؟ لیکن تم آسمان سے زمین پر کیسے آ گئے۔ خیر دروازہ کھلا ہے۔ تشریف لے آئیے۔

چندا: (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) نمستے۔

راکیش: نمستے۔

چندا: میں فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کی سکریٹری ہوں۔"

راکیش: یہ فائن فائن فائن آرٹس کیا بلا ہے؟

چندا: یہ ایک نئی سوسائٹی ہے۔ اس کا مقصد فائن آرٹس بالخصوص پینٹنگ کو فروغ دینا ہے۔ اس سوسائٹی کے جتنے ممبر ہیں وہ پینٹنگ میں عجیب و غریب تجربے کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ایسی تصویریں بنائی جائیں جن کو دیکھ کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

راکیش: خوب۔ بہت خوب! اچھا تو آپ کے پاس ایسی تصاویر ہیں جنھیں دیکھ کر...

چندا: جی ہاں! یہ دیکھئے میرا البم! اس میں میری تازہ ترین تصاویر ہیں۔"

راکیش: دکھائیے ذرا۔

چندا: (البم کھول کر ایک تصویر دکھاتے ہوئے) یہ پہلی تصویر ملاحظہ فرمائیے۔ اس کا نام ہے۔ "بندرا بن کی گوپی۔"

راکیش: (تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے) بندرا بن کی گوپی؟ مجھے تو گوپی وپی کہیں نظر نہیں آئی۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ آپ نے ایک بڑے کاشی پھل کے اوپر ایک چھوٹا کاشی پھل رکھ کر اس کے اوپر کوئلے کے دو ٹکڑے رکھ دئے ہیں۔

چندا: (ہنستے ہوئے) ہاہاہا۔ واہ پروفیسر صاحب۔ آپ جیسا سمجھدار آدمی بھی دھوکا کھا گیا
اجی جسے آپ بڑا کاشی پھل سمجھ رہے ہیں وہ گوپی کا پیٹ ہے۔ اور وہ جو چھوٹا
کاشی پھل ہے وہ اس کا سر ہے اور یہ کپڑے کے دو ٹکڑے نہیں۔ گوپی کی چمکتی
ہوئی آنکھیں ہیں۔

راکیش: ہُم۔ یہ بات ہے۔ اچھا ذرا دوسری تصویر دکھیے۔

چندا: ہاں یہ دوسری تصویر ہے۔ بھلا بتائیے یہ کیا ہے۔

راکیش: کچھ کہہ نہیں سکتا کہ یہ کیا ہے معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ یہ ایک بندر ہاتھ میں خربوزہ
پکڑ کر کوئیں میں اترنے کی کوشش کر رہا ہے۔

چندا: واہ پروفیسر صاحب خوب سمجھے، اجی یہ بندر نہیں مستقبل کا انسان ہے۔ اس کے
ہاتھ میں خربوزہ نہیں، ایٹم بم ہے اور وہ جو کنواں ہے۔ کنواں نہیں تباہی کا غار ہے
سمجھے آپ؟

راکیش: سمجھا تو نہیں لیکن چونکہ آپ ایسا کہتی ہیں اس لئے مان لیتا ہوں۔

چندا: دراصل یہ آپ کا قصور نہیں۔ یہ ہم آرٹسٹوں کا قصور ہے، ہم آپ کو ایسی تصاویر
بہت کم تعداد میں دے رہے ہیں اس لئے آپ انھیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔
آپ بھی بہت سے اور لوگوں کی طرح وہی تصاویر پسند کرتے ہیں جنھیں دیکھ کر کچھ سوچنا نہ پڑے

راکیش: یہ تو آپ بجا فرماتی ہیں۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ یہاں تشریف کیسے لائیں۔ اگر
آپ چاہتی ہیں کہ میں ان تصاویر پر ایک آدھ مضمون لکھوں تو یہ مجھ سے نہ ہوگا۔
کیونکہ جس چیز کو میں سمجھ نہیں سکتا اس کے متعلق کبھی نہیں لکھتا۔

چندا: جی نہیں، یہ بات نہیں۔ میں آپ سے اپنی سوسائٹی کے لئے چندہ لینے آئی ہوں۔

راکیش: چندہ ؟

چندا: جی ہاں چندہ۔ دیکھئے ہمارے بہت سے آرٹسٹ بھوکوں مر رہے ہیں۔ ایک کو پچھلے چھ ماہ سے کالی کھانسی کی شکایت ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ اُسے بہت جلد دق ہو جائے گی۔ دوسرے کا دماغ چل گیا ہے اسے پاگل خانے بھجوانا پڑے گا۔ تیسرے کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا ہے، اس کا آپریشن ہوگا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ روپے کی اشد ضرورت ہے۔

راکیش: اگر روپے کی ضرورت ہے تو آپ ان آرٹسٹوں کی تصاویر فروخت کر کے روپیہ حاصل کر سکتی ہیں۔

چندا: وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ کوئی شخص ان کی تصاویر خریدنا نہیں چاہتا۔

راکیش: اور خریدے بھی کیوں۔ جبکہ ان تصاویر کا سر ہے نہ پیر

چندا: یہ بات نہیں پروفیسر صاحب۔ دراصل لوگوں کا مذاق اتنا بگڑ چکا ہے کہ وہ ان تصاویر کی قدر نہیں کر سکتے۔ خیر یہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں۔ . . . اچھا تو کہئے کتنے روپے دے رہے ہیں آپ ؟

راکیش: آج مہینے کی ۲۸ تاریخ ہے۔ اور میرے بٹوے میں صرف بیس روپے ہیں۔

چندا: (مایوسی سے) یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ جیسا آرٹ کو سمجھنے والا کم از کم چالیس روپے تو دے گا۔

راکیش: معاف کیجئے، نہ تو میں اس قسم کے آرٹ کو سمجھتا ہوں اور نہ ہی چالیس روپے دے سکتا ہوں۔

چندا: اچھا تو بیس ہی لائیے۔

راکیش: میں آپ کو دے دوں اور میں خود ...

چندا: اچھا پانچ رکھ لیجئے میرا مطلب ہے سگرٹ پان وغیرہ کیلئے اور پندرہ دے دیجئے۔

راکیش: نہیں۔ پندرہ زیادہ ہیں۔

چندا: اچھا تو چودہ دے دیجئے۔ دیکھئے چودہ سے ایک کم نہ لوں گی۔ نکالئے نکالئے میں پرچی کاٹتی ہوں۔

راکیش: (بیدلی سے) ہیں تو یہ بھی زیادہ۔ لیکن خیر لیجئے۔

(روپے دیتا ہے)

چندا: شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔ فائن۔ فائن۔ فائن آرٹس سوسائٹی آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولے گی۔ اچھا نمستے۔

راکیش: نمستے۔

(چندا جاتی ہے)

راکیش: عجیب لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ یہ چندا بھی۔ اب کچھ کچھ سمجھ میں آرہا ہے کہ شاعر نے یہ کیوں کہا۔ ع چندا رے او ظالم چندا۔ اونہہ۔ فائن فائن فائن آرٹس سوسائٹی کتنا فضول نام ہے۔

(کوئی پھر دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

آواز: پروفیسر راکیش گھر پر ہیں۔

راکیش: (آواز پہچانتے ہوئے) کون نیلامبر۔ آؤ بھئی آؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔

(نیلامبر اور شششی اندر آتے ہیں)

نیلامبر: ہیلو راکیش۔

ششی : ہیلو پروفیسر۔
راکیش : آؤ بھئی بیٹھو۔
نیلامبر : نہیں ہم بیٹھیں گے نہیں۔ بس کھڑے کھڑے بات کریں گے۔
راکیش : کیوں خیر تو ہے۔
نیلامبر : ہاں خیر ہی ہے ششی اور ہم نے ایک نئی مہم شروع کی ہے اس کا نام ہے
"ایٹ مور وٹامن پلیز" "EAT MORE VITAMIN PLEASE"
"مہربانی کر کے اور وٹامن کھائیے"۔ تم جانتے ہو کہ آج کل مہموں کا زمانہ ہے۔
ہم نے سوچا ہے کہ ہم بھی کیوں نہ ایک مہم شروع کر دیں۔
راکیش : لیکن اس کی کیا ضرورت تھی۔ میرا تو خیال ہے لوگ پہلے ہی کافی وٹامن
کھاتے ہیں، میرا مطلب ہے امیر لوگ۔
ششی : بالکل غلط۔ دیکھئے اگر آپ وٹامن "اے" کھاتے ؛ تو آپ کے چہرے
کا رنگ ہلدی کی طرح پیلا نہ ہوتا۔
نیلامبر : اور اگر آپ وٹامن "سی" کھاتے تو آپ کے دانت اتنے کمزور نہ
ہوتے۔
ششی : اور اگر آپ وٹامن "اے، بی، سی" کھاتے تو آپ کا جسم اکہرا نہ ہوتا۔
راکیش : بھئی میرا جسم، میرا چہرہ، میرے دانت اچھے خاصے ہیں اور میرا خیال ہے
کہ میں کافی وٹامن کھاتا ہوں۔
نیلامبر : نہیں نہیں بالکل نہیں۔ یہی تو آپ کی غلطی ہے، آپ بھی ہزاروں لوگوں کی طرح
سمجھتے ہیں کہ آپ کافی وٹامن کھا رہے۔ حالانکہ آپ بہت کم وٹامن کھاتے ہیں

اچھا بھلا آپ نے کبھی کیلے کے چھلکے کھائے ہیں

راکیش: کیلے کے چھلکے؟ کیلے کے چھلکے کون کھا سکتا ہے۔

ششی: اجی پروفیسر صاحب کھانے والے سب کھاتے ہیں۔ اچھا آپ نے کبھی شیشم کے پتے کھائے ہیں۔

راکیش: شیشم کے پتے؟ یہ تو کبھی نہیں کھاتے۔ خدا وہ وقت نہ لائے کہ یہ کھانا پڑیں۔

ششی: اجی دعا کیجیئے کہ خدا آپ کو عقل دے، اور آپ بہت جلد شیشم کے پتے کھانا شروع کر دیں۔ معلوم ہے شیشم کے پتوں میں کتنے وٹامن ہوتے ہیں۔

راکیش: ہوتے ہوں گے لیکن میں شیشم کے پتے . . . .

نیلا مبر: اچھا چھوڑیئے۔ آپ نے کبھی سبز گھاس کھائی؟

راکیش: گھاس؟ کیا تم مجھے جانور سمجھتے ہو؟

نیلا مبر: اجی نہیں۔ سبز گھاس وٹامن "اے" اور "بی" کا سب سے بڑا مخزن ہے۔ دیکھیے گھوڑے، ہرن، بیل سب گھاس کھاتے ہیں اور کتنے طاقتور ہوتے ہیں۔

راکیش: گستاخی معاف۔ میں گھاس نہیں کھا سکتا۔

ششی: اور پروفیسر "یو ڈونٹ نو واٹ یو آر مسنگ":

YOU DONT KNOW WHAT YOUARE MISSNIG

نیلا مبر: آپ کو کم از کم دو سیر گھاس ضرور کھانا چاہیئے۔

راکیش: مجھے تو معاف ہی رکھئے۔ اچھا یہ بتائیے کہ آپ کی کیا خدمت کی جائے سگرٹ، لیمن، . . . . چائے؟

ششی: یہ تکلفات رہنے دیجئے۔ دیکھئے اس مہم کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ہمیں

روپے کی ضرورت ہے۔ آپ کھلے دل سے چندہ دے کر مدد کیجئے۔

راکیش: چندہ؟ لیکن آج تو مہینے کی ۲۸ تاریخ ہے، اور میرے بٹوے میں صرف چھ روپے رہ گئے ہیں۔

ششی: کوئی بات نہیں، کوئی بات نہیں۔ ہمیں چھ روپے ہی دے دیجئے۔

راکیش: چھ روپے تمھیں دے دوں اور میں کیا کروں۔

نیلامبر: آپ وٹامن کھائیے۔ ہاہا۔ سمجھے آپ۔

راکیش: اچھا تین روپے لے لیجئے۔

نیلامبر: تین روپے۔ اتنے بڑے پروفیسر سے صرف تین روپے، اتنی ضروری مہم کے لئے تین روپے۔ دیکھئے پانچ سے ایک کم نہ ہوگا۔

راکیش: اچھا بھئی ضد نہ کرو۔ پانچ لے لو۔

نیلامبر: اچھا لاؤ۔ ایک روپے کا ادھار رہا۔

راکیش: (پانچ روپے کا نوٹ دیتے ہوئے) لیجئے۔

نیلامبر: شکریہ . . . اچھا نمستے۔

ششی: نمستے۔

(نیلامبر اور ششی جاتے ہیں)

راکیش: مہینے کی ۲۸ تاریخ اور جیب میں صرف ایک روپیہ۔

(دروازہ کھٹ کھٹایا جاتا ہے)

راکیش: (اونچی آواز سے) اگر آپ بھی چندہ لینے آئے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔

(کھٹ کھٹ کھٹ کی آواز)

راکیش: کون ہے بھئی۔

بھولا: جی میں ہوں بھولا۔ سگرٹ لایا ہوں۔

راکیش: اوہ بھولا — میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ (بھولا سے) میں سمجھا کہ تم بھی چندہ ہوا

بھولا: چندا؟ کون چندا؟ کہیں وہی تو نہیں جس کے متعلق آپ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔

راکیش: نہیں نہیں۔ یہ دوسرا چندہ ہے۔ اِس چندہ نے تو آج کمر ہی توڑ کر رکھ دی ہے۔

بھولا: کیا مطلب سرکار؟

راکیش: کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ اچھا کوئی مجھ سے ملنے آئے تو اسے اندر مت آنے دینا۔

بھولا: اسے کیا کہوں سرکار؟

راکیش: اسے کہو کہ جب سے چندا آسمان سے اتر کر زمین پہ آگیا ہے، صاحب
چندہ سے گھبرا کر پاتال میں چلے گئے ہیں۔

بھولا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سرکار؟

راکیش: بھولا تم نہیں جانتے۔ چندہ کتنا ظالم ہوتا ہے۔

بھولا: صاحب۔ میں ایک دم ڈلی ہوں۔ چندہ کو سمجھنا میرے بس کا روگ نہیں اچھا
تو ملاقاتیوں سے کیا کہہ دوں؟

راکیش: وہی جو میں نے کہا ہے۔

بھولا: بہت اچھا سرکار، بہت اچھا۔ ؛

کلاونائش عرف ستیاناس

کردار:-

سیٹھ دمڑی پرشاد ـــــــــــ	پروڈیوسر
دھوم کیتو ـــــــــــ	ڈائرکٹر
گھسیٹا رام ـــــــــــ	ہیرو
شنگار بیگم ـــــــــــ	ہیروئن
مرزا بوڑم بیگ ـــــــــــ	افسانہ نویس
سرگم شنگارپوری ـــــــــــ	شاعر

پہلا منظر

سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرہ

(سیٹھ دمڑی پرشاد اخبار پڑھ رہے ہیں۔ دھوم کیتو داخل ہوتا ہے)

دھوم کیتو: نمستے سیٹھ صاحب!

دمڑی پرشاد: اخبار سے نظریں اٹھا کر بڑی بے رخی سے) نمستے۔

دھوم کیتو: مجھے پہچانا سیٹھ دمڑی پرشاد جی؟

دمڑی پرشاد: (سر کو کھجلاتے ہوئے) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔

دھوم کیتو: (ہنس کر) واہ سیٹھ صاحب۔ اتنی جلدی بھول گئے! اجی میں ہی دھوم کیتو

ہوں دھوم کیتو۔ میں آپ کے محلے میں چنا زور گرم بیچا کرتا تھا۔ یاد ہے۔

چنا چُرمُر چُرمُر بولے ۔۔۔ بابو کھانے کو منہ کھولے

چنا کھاتے سب بنگالی ۔۔۔ جن کی دھوتی ڈھیلی ڈھالی

چنا زور گرم بابو۔ میں لایا مزیدار۔ چنا زور گرم

دمڑی پرشاد: (پہچانتے ہوئے) اوہ! دھوم کیتو! بھئی خوب ملے۔ کہو چنا زور گرم کا کیا حال ہے۔

دھوم کیتو: اجی چنا زور گرم کو گولی ماریئے۔ اب تو آپ کی دعا سے بندہ فلم لائن میں ہے۔

دمڑی پرشاد: فلم لائن میں چنا زور گرم بیچتے ہو گیا۔

دھوم کیتو: جی نہیں۔ بندہ فلمیں ڈائرکٹ کرتا ہے یعنی بندہ فلم ڈائرکٹر۔ ۔ ۔

دمڑی پرشاد: (حیرانی سے) فلم ڈائرکٹر! لیکن تم فلم ڈائرکٹر کیسے بن گئے؟

دھوم کیتو: دیکھیے چنا زور گرم بیچ بیچ کر جب تنگ آگیا تو میں ایک تھیٹر میں گھنٹی بجانے پر ملازم ہو گیا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اسی تھیٹر میں پردے کھینچنے لگا۔ وہاں سے جو ترقی کی تو دیواروں پر فلموں کے اشتہار لگانے لگا۔ پھر ایک فلم سٹوڈیو کا دربان بن گیا۔ اب کی بار جو چھلانگ لگائی تو اپنے کو اچھا خاصا ڈائرکٹر پایا۔

دمڑی پرشاد: خوب خوب۔ بہت خوب۔ تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ اچھا یہ کہو کہ تم نے کوئی فلم بھی ڈائرکٹ کی یا نہیں۔

دھوم کیتو: فلموں کی کچھ نہ پوچھئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ کوئی ہی کام کی فلم ہو گی جو میں نے ڈائرکٹ نہیں کی۔ "پان کا پتہ" میں نے ڈائرکٹ کی۔ "حکم کی بیگم" کا میں خالق ہوں۔ "اینٹ کا بادشاہ" بھی خاکسار نے بنایا۔ اور ان دنوں "چڑیا کا غلام" فلمانے

کی فکر میں ہوں۔

دمڑی پرشاد: خوب۔ خوب۔ تو یوں کہئے کہ آپ نے قریب قریب ساری کی ساری تاش ہی فلما دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کافی پہنچے باز ہیں۔

دھوم کیتو: آپ کی نوازش ہے۔ ورنہ بندہ کس قابل ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا۔ یہ کہئے کہ فلم انڈسٹری میں منافع کی کیا گنجائش ہے۔

دھوم کیتو: گنجائش سی گنجائش! سیٹھ صاحب! فلم انڈسٹری تو سونے کی کان ہے پانچ لاکھ لگاؤ، دس لاکھ کماؤ۔ دس لاکھ لگاؤ، بیس لاکھ کماؤ، چالیس لاکھ کماؤ۔ بس منٹوں میں ہی وارے نیارے ہو جاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد: ہوں! یہ بات ہے۔

دھوم کیتو: جی ہاں۔ بالکل ٹھیک عرض کر رہا ہوں۔

دمڑی پرشاد: اچھا سنو۔ پچھلے دنوں ہم نے مونگ پھلی کے بیوپار میں کافی روپیہ کمایا ہے۔ اگر ہم ایک فلم بنائیں تو کیسی رہے۔

دھوم کیتو: بس یہ سمجھ لیجئے کہ چھ مہینے کے اندر اندر آپ دمڑی پرشاد سے کروڑی پرشاد بن جائیں گے۔

دمڑی پرشاد: واقعی؟

دھوم کیتو: اگر یقین نہ آئے تو تجربہ کر لیجئے۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو زیادہ سے زیادہ سرمایہ کتنا لگے گا؟

دھوم کیتو: زیادہ سے زیادہ۔ یہی کوئی پانچ لاکھ۔

دمڑی پرشاد: پانچ لاکھ تو کوئی زیادہ نہیں۔

دھوم کیتو: تو پھر لائیے ہاتھ۔ کہو تو آج ہی مہورت کر دیں۔

دمڑی پرشاد: لیکن سٹوری یعنی کہانی کا کیا ہو گا۔

دھوم کیتو: اس کی فکر نہ کیجئے۔ یہ سب مجھ پر چھوڑ دیجئے۔ میرے ایک دوست ہیں مرزا بوڑم بیگ۔ ایسی کہانی لکھیں گے کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

دمڑی پرشاد: بوڑم بیگ! عجیب سا نام ہے۔

دھوم کیتو: نام تو عجیب ہے ہی شکل اس سے بھی زیادہ عجیب ہے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک دم نہ صرف بوڑم نظر آتے ہیں بلکہ دراصل ہیں بھی بوڑم ہی! ہر لحاظ سے بوڑم۔ میرا مطلب ہے کہ جسمانی اور خاندانی لحاظ سے ان کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو وہ بوڑم ہے۔

دمڑی پرشاد: اچھا تو کبھی ان سے ملاقات تو کرائیے۔

دھوم کیتو: آج ہی لیجئے۔ میں ابھی ان کو بلوا بھیجتا ہوں۔ پہلی ملاقات ہی میں آپ مان جائیں گے کہ ہماری فلم کی کہانی بوڑم صاحب کے علاوہ کوئی نہیں لکھ سکتا۔

دمڑی پرشاد: اور "گانے" کون لکھے گا۔

دھوم کیتو: گانوں کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ میرے ایک دوست ہیں ہیرم شکارپوری بخدا گانے لکھتے ہیں کہ جادو کرتے ہیں۔ بھلا چنگا انسان سُنے تو اس پر وجد یعنی وحشت طاری ہو جائے بس یوں سمجھ لیجئے کہ ایک گانا ایسا ہو گا کہ سارے ہندوستان میں ایک کہرام مچ جائے گا۔

دمڑی پرشاد: ہیرو اور ہیروئن کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟

دھوم کیتو: ہیرو تو کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے۔ اس کے متعلق سوچنا بیکار ہے۔

اگر کوئی اور نہ ملا تو یہ خاکسار حاضر ہے۔ ہیروئن کے متعلق عرض ہے کہ ایک لڑکی ہے شنگار بیگم۔ سیٹھ صاحب ذرا نام ملاحظہ فرمائیے۔ شنگار بیگم! میں اسے کبھی جانتا تھا۔ خیر ہٹائیے اسے۔ ع

یہ قصہ ہے جب کہ آتش جواں تھا

اب تو صاحب مہینوں ملاقات کی نوبت نہیں آتی۔ میرا خیال ہے کہ ہیروئن کا پارٹ اسے دیا جائے۔ ایکٹنگ تو وہ بالکل نہیں جانتی لیکن شکل و صورت ایسی پائی ہے کہ آپ دیکھیں گے تو ایک دم اس پر لٹو ہو جائیں گے۔ اور میری رائے میں ہیروئن میں یہی ایک خوبی ہونی چاہئے۔ یعنی آدمی دیکھے تو فوراً۔۔۔۔۔۔

دمڑی پرشاد: مجھے آپ سے بالکل اتفاق ہے۔ لیکن وہ لے گی کیا؟

دھوم کیتو: لینے دینے کی بات چھوڑیئے۔ اس کے پاس پرماتما کا دیا ہوا سب کچھ ہے۔ وہ تو محض شوق کی خاطر یا یوں کہیے کہ میری خاطر یا آرٹ کی خاطر یا ہم سب کی خاطر فلم لائن میں آنا چاہتی ہے۔

دمڑی پرشاد: لیکن شنگار بیگم کوئی اچھا نام نہیں۔ کیا اسے بدلا نہیں جا سکتا۔

دھوم کیتو: کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ شنگار بیگم کی بجائے آپ اسے کھلا یا لیگلا۔ ریوا یا میوہ۔ رجنی یا سجنی کوئی بھی نام دے سکتے ہیں۔ میرے خیال میں اسے کوئی بھی عذر نہ ہوگا۔

دمڑی پرشاد: سب سے ضروری بات تو میں نے آپ سے پوچھی ہی نہیں۔

دھوم کیتو: ہاں ہاں فرمائیے۔ ایسی کونسی بات ہے؟

دمڑی پرشاد: آپ فلم ڈائرکٹ کرنے کا کیا لیں گے؟

دھوم کیتو: (قہقہہ لگاکر) ہاہاہا۔ بڑی ضروری بات پوچھی آپ نے! بندہ پرور میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ دیکھئے۔ پیسے دینے کے متعلق یہ عرض ہے کہ مجھے کچھ بھی دے دیجئے۔ لیکن صرف اتنی بات کا خیال رکھئے کہ میری اصلی تنخواہ اور پبلسٹی تنخواہ میں کافی فرق ہونا چاہیئے۔

دمڑی پرشاد: میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

دھوم کیتو: دیکھئے سیٹھ صاحب۔ فلم لائن میں ہر شخص کی دو تنخواہیں ہوتی ہیں۔ ایک اصلی۔ دوسری پبلسٹی۔ مثال کے طور پر میری اصلی تنخواہ تو ہوگی صرف تین سو روپیے لیکن میری پبلسٹی تنخواہ ہوگی تین ہزار۔ سمجھے آپ اس نکتے کو!

دمڑی پرشاد: بالکل۔ بالکل۔ مجھے منظور ہے۔ آپ آج ہی سے فلم کی تیاری شروع کر دیجئے۔

دوسرا منظر

(مرزا بوڑم بیگ کا کمرہ)

(دھوم کیتو اور بوڑم بیگ ایک بینچ پر بیٹھے ہوئے ہیں)

دھوم کیتو: (قہقہہ لگاکر) ہاتھ لاؤ استاد بوڑم۔ ایسی مرغی پھنسی ہے کہ وارے نیارے ہو جائیں گے۔

بوڑم بیگ: لیکن یہ سیٹھ دمڑی پرشاد ہیں کون۔ میں نے تو ان کا نام پہلی بار سنا ہے۔

دھوم کیتو: کیا بتاؤں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ نرے کاٹھ کے اُلو ہیں۔ بلکہ میرا تو

خیال ہے کہ انھیں کاٹھ کا اُلّو کہنا بھی بے چارے کاٹھ کے اُلّو کی توہین ہے۔

بوڑم بیگ: لیکن وہ آپ کے جال میں پھنس کیسے گئے۔

دھوم کیتو: (ہنس کر) اجی بوڑم صاحب کاٹھ کا اُلّو نہیں پھنسے گا تو کیا ہم تم پھنسیں گے۔ خیر اب آپ جلدی سے ایک کہانی لکھ ڈالئے۔ باقی سب انتظام میں کر لوں گا۔

بوڑم بیگ: کس قسم کی کہانی چاہتے ہیں آپ؟

دھوم کیتو: نام ذرا مزیدار ہونا چاہیے۔ جیسے "کلاونائش عرف سنیاناس" پلاٹ ہو چپٹ پٹا سا۔ قدم قدم پر محبت۔ منٹ منٹ بعد ایک آدھ پھڑکیلا منظر بس کہانی کیا ہو، کہانی کیا ہو، بارہ مسالے کی چاٹ ہو۔

بوڑم بیگ: آپ تسلی فرمائیے۔ کہانی بالکل ایسی ہی ہو گی کہ ایک بار تو سیٹھ صاحب سن کر پھڑک اُٹھیں گے۔ اگر ہنس ہنس کر پاگل نہ ہو جائیں تو میرا نام بدل دیجیے گا۔

دھوم کیتو: اچھا تو اب میں چلتا ہوں۔ آپ کل دس بجے کہانی لے کر سیٹھ صاحب کے یہاں مجھے ملئے۔ پتہ نوٹ کر لیجیے۔ ۱۲۵، چمپئی روڈ۔ سرگم شکار پوری کو بھی کہلوا بھیجا ہے۔ وہ بھی گانے لے کر وہاں پہنچ جائے گا۔

تیسرا منظر

سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرہ

(سیٹھ دمڑی پرشاد بہی کھاتہ دیکھ رہے ہیں۔ دھوم کیتو اور بوڑم بیگ

داخل ہوتے ہیں)

دھوم کیتو : آداب عرض سیٹھ صاحب ۔ ۔ ۔ ۔ مرزا بوڑم بیگ سے ملئے۔ آپ اپنے وقت کے سب سے بڑے سٹوری رائٹر ہیں۔ فلم لائن میں آپ کو مہا لیکھک بوڑم اعظم کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور آپ ہیں سیٹھ دمڑی پرشاد!

بوڑم بیگ : (مصافحہ کرتے ہوئے) بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔

دمڑی پرشاد : (بوڑم سے) تشریف رکھیئے۔ مہا بوڑم اعظم لیکھک صاحب۔

بوڑم بیگ : معاف کیجئے گا۔ میرا نام مہا لیکھک بوڑم اعظم ہے۔

دمڑی پرشاد : اوہ۔ معاف کیجئے گا بوڑم صاحب۔

دھوم کیتو : سیٹھ صاحب! بوڑم اعظم کہیئے۔ محض بوڑم نہیں۔

دمڑی پرشاد : اوہ! دوبارہ معاف کیجئے۔

دھوم کیتو : سیٹھ صاحب۔ بوڑم اعظم نے ہماری فلم کے لئے کہانی لکھی ہے۔ کہانی کیا ہے۔ کہانی کیا ہے طمانچہ ہے۔ فلم انڈسٹری کے منہ پر طمانچہ۔ ایسا زبردست طمانچہ کہ فلم انڈسٹری چیخ اُٹھے گی۔

دمڑی پرشاد : اوہ! کافی خطرناک کہانی معلوم ہوتی ہے۔

بوڑم بیگ : نہیں نہیں سیٹھ صاحب! آپ تو یونہی گھبرا گئے۔ ذرہ بھر بھی خطرناک نہیں۔ دراصل بات یہ ہے سیٹھ صاحب کہ میں خالص لٹریچر لکھتا ہوں۔ مطلب یہ کہ میں کہانی ایسی لکھتا ہوں جسے لٹریچر کہا جاتا ہے بس یہی مجھ میں خوبی ہے۔ ویسے لکھنے کو کون کہانی نہیں لکھ رہا۔ چھوٹے

کے سوداگر کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جوتے بیچنے والے کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جوتے چرانے والے بھی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ کہانیاں لکھنے کا مرض یوں کہیئے کہ وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ لیکن معاف کیجئے میں جو کہانی لکھتا ہوں وہ خالص لٹریچر ہوتا ہے۔

دمڑی پرشاد: یہ لٹریچر کیا بلا ہوتا ہے۔

بودڑم بیگ: لٹریچر یعنی لٹریچر کو کہتے ہیں۔ جو بالکل۔ جو یعنی۔ جو سو فیصدی ....

دھوم کیتو: ہاں ہاں جو سو فی صدی لٹریچر ہو۔ یعنی جسے ایک بچہ بھی پڑھے تو فوراً پکار اُٹھے کہ یہ لٹریچر ہے۔

دمڑی پرشاد: خیر ہوتا ہوگا۔ اچھا تو کیا آپ اس کہانی کا خلاصہ سنا سکتے ہیں؟

بودڑم بیگ: اسی لئے تو حاضر ہوا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔ کہانی کا نام میں نے "ڈائرکٹر صاحب کی اجازت سے رکھا ہے یعد کلاونانش عرف ستیاناس" پہلے تو یہ کہئے کہ نام پسند آیا؟

دمڑی پرشاد: کافی اچھا نام ہے۔

بودڑم بیگ: شکریہ۔ مجھے معلوم تھا کہ نام ضرور پسند آئے گا۔ کہانی بھی ضرور پسند آئے گی۔

دمڑی پرشاد: پہلے ذرا سُنا تو دیجئے کہ کہانی کس قسم کی ہے۔

بودڑم بیگ: کہانی کی کچھ نہ پوچھئے۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ .... کہ ....

دھوم کیتو: کہ سو فیصدی لٹریچر ہے۔

دمڑی پرشاد: مجھے کہانی سنایئے۔ لٹریچر وٹریچر رہنے دیجئے۔

بوڑم بیگ: بہت اچھا۔ تو سنئے۔ کہانی کا ہیرو پریم کمار جو پریم نگر کا رہنے والا ہے۔ اپنے ہمسائے پریم ناتھ کی نوجوان لڑکی پریم کماری سے پریم کرتا ہے۔

دھوم کیتو: کیا کہنے۔ کیا کہنے بوڑم صاحب۔ کیا بات پیدا کی ہے۔

بوڑم بیگ: آداب عرض . . . ہاں صاحب۔ تو پریم کمار پریم کماری سے پریم کرتا ہے۔ لیکن وہ اس انداز سے پریم کرتا ہے کہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتا کہ آیا وہ پریم کر رہا ہے یا پاگل خانے جانے کی تیاری۔ کبھی اپنی محبوبہ کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے کبھی رونے لگتا ہے۔ کبھی ڈاڑھی بڑھا لیتا ہے۔ کبھی مونچھیں کٹوا دیتا ہے کبھی سرد سرد آہیں بھرتا ہے اور کبھی گرم گرم پکوڑے کھاتا ہے۔

دمڑی پرشاد: کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ واقعی محبت کا یہ انداز بہت نرالا ہے۔

بوڑم بیگ: ابھی کیا سنا ہے آپ نے۔ ذرا آگے چل کر دیکھئے۔ کیا کیا گل کھلتے ہیں۔ جی ہاں۔ تو صاحب پہلا گل یہ کھلتا ہے کہ پریم کماری کی ماں کو اس چوری چھپے کی محبت کا علم ہو جاتا ہے اور وہ پریم کماری کو مار مار کر —— مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتی ہے۔

دمڑی پرشاد: بہت خوب۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہئے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ در اصل اس سین کا مطلب یہ ہے کہ نوجوان لڑکیوں کو عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ یعنی انھیں چھپ چھپ کر اپنے ہمسائے کے لڑکے سے محبت نہیں کرنی چاہئے۔

دمڑی پرشاد: کھلم کھلا محبت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

بوڑم بیگ : یہ میں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا۔ کیونکہ کھلم کھلا محبت کا اپنی کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاں صاحب تو پریم کماری کو ایک کمرے میں بند کر دیا جاتا ہے۔ اور یہاں پریم کمار اور پریم کماری مل کر ایک دوگانا گاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد : لیکن پریم کمار بند کمرے میں کیسے آ گیا۔

دھوم کیتو : سیٹھ صاحب اسے سمجھنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔ یہ ٹیکنیکل پوائنٹ ہے۔ کئی لوگ اسے کیمرا ٹرک CAMERA TRICK بھی کہتے ہیں۔ خیر آپ کی جانے بلا۔ بس آپ فرض کر لیجئے کہ پریم کمار بند کمرے میں آ جاتا ہے ورنہ دو۔ گانے کا . . . . . ورنہ دوگانے کا . . . .

سرگم ٹشکار پوری : (کمرے میں داخل ہوتے ہوئے) ورنہ دو . . . دو . . . گانے کا ستیاناس ہو جائے گا۔

دمڑی پرشاد : (سرگم کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کون ہیں؟

دھوم کیتو : اوہ! آپ ہیں سرگم ٹشکار پوری۔ اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر۔ مہا کوی۔ شاعر اعظم۔ سرگم ٹشکار پوری صاحب۔

دمڑی پرشاد : (سرگم کی طرف غور سے دیکھنے کے بعد) آپ تو مجسم ہارمونیم نظر آتے ہیں۔

سرگم ٹشکار پوری : ٹشک ٹشک۔ ٹشک۔ شکریہ شکریہ۔ دراصل میرا نام پن پن پنڈت رونقی رام رولتی ہے لیکن میرے سب دو . . . . . دو . . . . دوست مجھے سرگم ٹش ٹش ٹشکار پوری کہتے ہیں۔ یہاں تک کہ میری بی۔ بی . . . . بی . . . بیوی بھی سرگم ڈا . . . ڈا . . . ڈارلنگ کہنے لگی ہے۔

دھوم کیتو: سرگم صاحب ہمیں اپنی فلم کے لئے ایک مزیدار دوگانے کی ضرورت ہے۔ کیا آپ کے پاس کوئی ایسا دوگانا ہے؟

سرگم شنکارپوری: اجی صاحب۔ دو۔ دو۔ ۔ ۔ دوگانے تو مجھ سے تھو۔ تھو۔ تھوک کے بھاؤ سے لیجئے۔ جو۔ جو۔ جوتا پہنتے پہنتے دوگانا لکھ ڈالتا ہوں۔"

دھوم کیتو: سچوایشن (SITUATION) اچھی طرح سمجھ لیجئے۔ ہیروئن کو اس کی ماں نے بیدردی سے پیٹا ہے۔ وہ ایک کمرے میں بند کردی گئی ہے۔ جہاں ہیرو صاحب چاندنی رات میں اس سے ملتے ہیں۔ اور ملنے سے پیشتر دوگانے کا پہلا بول گاتے ہیں۔

سرگم شنکارپوری: سچ۔ سچ۔ سچ۔ سچوایشن میں نے بالکل سمجھ لی ہے۔ در اصل مے۔ مے۔ میرا واسطہ اس قسم کی سچ۔ سچ۔ سچ۔ سچوایشنز سے ہی اکثر رہتا ہے یہ دیکھیے میں نے فل۔ فل۔ فلمی گانوں کی چھ نا بیلیں تیار کر رکھی ہیں پہلی فائل کا نام ہے۔ پ۔ پ۔ پ پریم کے گانے۔ ان گانوں میں پریم ہی پریم ہے۔ دوسری فائل ہے۔ مو۔ مو۔ موت کے گانے۔ ان گانوں میں موت ہی موت ہے تیسری فائل شا۔ شا۔ شادی کے گانے اور چوتھی بربربادی کے گانے۔ پانچویں میں ہیں ق ق ق۔ قوالیاں۔ اور چھٹی ابھی خا خا خالی پڑی ہے۔

دھوم کیتو: بہت خوب۔ بہت خوب۔ اچھا کوئی مزیدار دوگانا سیٹھ صاحب کو ذرا ترنم کے ساتھ سنائیے۔

سرگم شنکارپوری: سنئے صاحب:

جگ جگ جگمگاتی رات   میرا چندا میرے ساتھ

اماں سو رہی ہے

جھل جھل جھلملاتی رات　　　میری گھڑی بجائے سات

منّی رو رہی ہے

دمڑی پرشاد: معاف کیجئے گا سرگم صاحب لیکن منّی کے رونے کا اس دوگانے سے کیا تعلق ہے؟

سرگم شکارپوری: وا۔ وا۔ سیٹھ صاحب۔ آپ یہ بھی نہیں سمجھ پائے۔ بن بن بن بندہ پرور! اس دوگانے میں مَیں نے چاند۔ چاند۔ چاندنی رات کا نقشہ پیش ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جب ام۔ ام۔ اماں سوتی ہے تو منّی رو یا کرتی ہے۔ دوسرے بچے سا۔ سات بجے کے قریب ضرور روتے ہیں۔ کیونکہ اس وقت انھیں بھو۔ بھوک لگتی ہے۔

دھوم کیتو: واہ سرگم صاحب۔ واہ! واہ! کیا نکتہ پیدا کیا ہے۔

سرگم شکارپوری: آداب عرض۔ کہئے دوگانا پسند آیا؟

دھوم کیتو: اچھا ہے۔ کافی اچھا ہے۔ ایک آدھ اور سنا دیجئے۔

سرگم شکارپوری: سُنئے۔ عرض کیا ہے۔

ٹن ٹن ٹن۔ میرا بھو۔ بھو بھولا بچن

ہائے میں کیا کروں۔ ہائے میں کیا کروں

چھن چھن چھن میری بھولی دلہن

کہیں ڈوب مروں۔ کہیں ڈوب مروں

ٹم۔ ٹم۔ ٹم۔ میرا بھولا بلم

میں تو آہیں بھروں۔ ہائے آہیں بھروں

چھم ۔ چھم ۔ چھم ۔ مجھے کھائے یہی غم

کیسے پیار کروں۔ ہائے پیار کروں

دھرم کیتو : بہت خوب سرگم صاحب۔ آپ نے تو قلم توڑ کر رکھ دیا ہے۔

سرگم شکارپوری : اجی تو ۔ تو ۔ توڑا کہاں ہے۔ وہ کم کم کم بخت تو ابھی میری جیب میں سلامت پڑا ہے۔

دمڑی پرشاد : سرگم صاحب۔ آپ کی جتنی تعریف کی جائے۔ کم ہے۔ دوگانا لکھنے میں تو آپ کو کمال حاصل ہے۔

سرگم شکارپوری : بن بن بن بندہ نوازی ہے۔ ورنہ خا خا خاکسار کس قابل ہے۔

دھوم کیتو : ہاں تو سیٹھ صاحب باقی کہانی بھی سن لیجیے۔ بوڑم صاحب انتظار کر رہے ہیں۔

دمڑی پرشاد : ہاں بوڑم صاحب۔ باقی کہانی بھی سنا دیجیے۔

بوڑم بیگ : ہاں صاحب تو پریم کماری کو جب کمرے میں بند کیا جاتا ہے اور پریم کمار اس سے ملاقات کرنے کے بعد گھر جاتا ہے۔ تو عین اس وقت کہیں قریب سے گھڑی بارہ بجاتی ہے اور دور سے الّو کی چیخ سنائی دیتی ہے۔ الّو کی چیخ سن کر پریم کماری بے ہوش ہو جاتی ہے۔

دھوم کیتو : کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ یہ بالکل نیا ٹچ ہے۔ کم از کم میں نے کسی فلم میں نہیں

دکھایا کہ اُلّو کی چیخ سُن کر ہیروئن بے ہوش ہو جائے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ بالکل انوکھا پلاٹ ہے۔ تو صاحب! جب صبح پریم کماری کی ماں دروازہ کھولتی ہے تو کیا دیکھتی ہے۔ کیا دیکھتی ہے کہ پریم کماری غائب ہے۔ اور اس کی بجائے بستر پر ایک بہت بڑا سا اُلّو سو رہا ہے۔

دمڑی پرشاد: (حیرانی سے) ہائیں! لڑکی کی بجائے اُلّو؟

بوڑم بیگ: جی ہاں اُلّو! بالکل اُلّو! یعنی ایک دم اُلّو! اس پلاٹ سے میں نے (SUSPENSE) پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

دھوم کیتو: اور حق تو یہ ہے کہ خوب (SUSPENSE) پیدا کی ہے۔

بوڑم بیگ: اُلّو کو دیکھ کر پریم کماری کی ماں بے ہوش ہو جاتی ہے۔ اسے ہسپتال میں پہنچایا جاتا ہے۔ جہاں ہوش میں آنے کے بعد وہ ایک کمپونڈر سے محبت کرنے لگتی ہے۔

دمڑی پرشاد: شادی شدہ عورت کمپونڈر سے محبت کرنے لگتی ہے۔ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

بوڑم بیگ: سیٹھ صاحب شاید میں نے آپ کو نہیں بتایا کہ پریم کماری کی ماں بیوہ ہے۔ در اصل میں اس کہانی میں ایک بڑے نازک سماجی مسئلے کا حل پیش کرنا چاہتا ہوں میری مراد ”دھو ادواہ“ سے ہے۔

دمڑی پرشاد: ہاں تو اس کے بعد کیا ہوتا ہے؟

بوڑم بیگ: اس کے بعد ایک عجیب واقعہ پیش آتا ہے۔ پریم کمار پریم کماری کی کھوج میں گھر سے نکلتا ہے، شہر سے دُور اور شمشان کے قریب اس کی

ملاقات ایک بدصورت عورت سے ہوتی ہے جسے دیکھ کر پریم کمار بیہوش ہوجاتا ہے۔ اسے ہسپتال لے جایا جاتا ہے۔ جہاں ہوش میں آنے کے بعد وہ پریم کماری کی ماں سے جو کہ اس ہسپتال میں اب نرس بنی ہوئی ہے لڑنے لگتا ہے۔

دمڑی پرشاد: اس کے بعد؟

بوڑم بیگ: اس کے بعد وہ ایک بار پھر پریم کماری کی تلاش میں روانہ ہوتا ہے۔ ایک شہر سے۔ دوسرے شہر۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں۔ ہر راہ گیر کو روک کر پوچھتا ہے۔ کیا تم نے پریم کماری کو دیکھا ہے؟ کیا تم پریم کماری کو جانتے ہو؟ کیا تم مجھے پریم کماری کے پاس لے چلوگے؟"

دھوم کیتو: بہت خوب۔ بہت خوب۔ یہ واقعی ٹراڈرامیٹک پلاٹ ہے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ پریم کمار یہ سوال اتنی بار کرتا ہے کہ اس کا گلا بیٹھ جاتا ہے وہ ایک بار پھر ہسپتال میں جاتا ہے اور اپنے گلے میں دوا لگوا کر پریم کماری کی ماں کے نئے خاوند سے ہاتھا پائی کرنے لگتا ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں۔ اس لڑائی میں ہسپتال کی شیشیاں۔ میزیں، کرسیاں توڑی جاتی ہیں۔ آخر ہسپتال کا بڑا ڈاکٹر بیچ بچاؤ کر کے دونوں کی صلح کرا دیتا ہے۔

دمڑی پرشاد: پھر کیا ہوتا ہے؟

بوڑم بیگ: ہسپتال سے آنے کے بعد پریم کمار بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور خودکشی کرنے کے ارادے سے قطب مینار پر چڑھنے لگتا ہے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں۔ آپ کا خیال بالکل صحیح ہے۔ ہاں صاحب تو جب

پریم کمار قطب مینار کی آخری منزل پر پہنچتا ہے تو دیکھتا ہے کہ ایک نوجوان اس سے پہلے خودکشی کرنے کی غرض سے کھڑا ہے۔ یہ نوجوان دراصل پریم کماری ہے۔

سرگم شنگارپوری: پ۔پ۔پ۔پریم کماری ہے۔ واہ۔ واہ۔ بوبوڑم صاحب کیا بات ہے۔

بوڑم بیگ: جی ہاں پریم کماری ایک لڑکے کے بھیس میں وہاں کھڑی ہے۔ آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں۔ اور وہیں کھڑے کھڑے ایک دوگانہ گاتے ہیں۔

دمڑی پرشاد: بہت خوب۔ لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ گھر سے غائب ہونے کے بعد پریم کماری کہاں جاتی ہے۔

بوڑم بیگ: سیٹھ صاحب! یہی تو اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ فلم دیکھنے والے سوچ سوچ کر پاگل ہو جائیں گے کہ پریم کماری کہاں گئی لیکن انھیں کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ اس پچ سے تو میں نے زبردست SUSPENSE پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیوں ڈائرکٹر صاحب۔ کیا خیال ہے آپ کا؟

دھوم کیتو: بوڑم صاحب۔ آپ بجا فرماتے ہیں۔ دراصل جب تک کہ کہانی میں SUSPENSE نہ ہو وہ بالکل بیکار ہے۔ اور آپ کی کہانی میں تو SUSPENSE اس قدر ہے۔ اس قدر ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں SUSPENSE کے علاوہ اور کچھ ہے ہی نہیں۔

بوڑم بیگ : آداب عرض ۔ آداب عرض ۔

دمڑی پرشاد : میرے خیال میں کہانی میں کافی جان ہے ۔

بوڑم بیگ : اجی صاحب ۔ جان کیسے نہ ہوگی ۔ اس میں پندرہ CLIMAX ہیں ۔ ۲۶ ۔ ACCIDENTS ہیں ۔ اور چالیس گانوں کی گنجائش ہے ۔ اور پھر سب سے بڑی خوبی یہ کہ ایک دم کامیڈی شروع سے آخر تک COMEDY یعنی ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے گولڈن نہیں تو سلور جوبلی تو ضرور منائے گی ۔

سرگم شنکار پوری : ہاہاں صاحب کیوں نہیں منائے گی ۔ آپ کی دعا سے ایک ایک گانا ایسا ہوگا کہ ہٹ سانگ ، ہر کوچوان ، ہر ٹیکسی ڈرائیور ہر ننھا منا خیرا اسے گاتا نہ پھرے تو سرگم نام نہیں ۔

دھوم کیتو : اور ڈائرکشن ایسی ہوگی سیٹھ صاحب کہ لوگ دانتوں تلے انگلیاں دبائے پھریں گے ۔ آپ کی دعا سے ایسے پیچ ہوں گے کہ ہالی وڈ سے چل کر لوگ اسے دیکھنے آئیں گے ۔

دمڑی پرشاد : اگر یہ بات ہے تو آپ پرماتما کا نام لے کر شوٹنگ شروع کر دیجیے ۔ روپے کی پروا نہ کیجیے ۔ پانی کی طرح بہایئے ۔ لیکن ایک دفعہ فلم ایسی بنا دیجیے کہ چھکے نہیں تو کم از کم تکنے ضرور ہو جائیں ۔

دھوم کیتو : آپ تسلی رکھیے سیٹھ صاحب . . . ہاں کوئی اور بات ؟

دمڑی پرشاد : اور تو کوئی خاص بات نہیں ۔ ہاں . . . آپ نے ابھی شنگار بیگم سے ملاقات نہیں کرائی ۔

دھوم کیتو: اوہ۔ سنگار بیگم۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے۔ وہ ایک دن میں وہ آپ سے ملنے کے لئے آئے گی۔

ڈمری پرشاد: اچھا نواب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔

دھوم کیتو: بوڑم بیگ۔ سرگم شکارپوری! آداب عرض!

چوتھا منظر

دھوم کیتو کا کمرہ

(دھوم کیتو گھنٹی بجاتا ہے۔ چپراسی اندر آتا ہے)

دھوم کیتو: (چپڑاسی سے) دیکھو۔ ہم نے کچھ لیکھک مکالمے لکھنے کے لئے بلائے ہیں۔ انھیں باری باری اندر بھیجدو۔

چپڑاسی: بہت اچھا سرکار۔

(ایک لیکھک اندر آتا ہے)

لیکھک: آداب عرض۔

دھوم کیتو: آداب عرض۔

لیکھک: کیا میں بیٹھ سکتا ہوں۔

دھوم کیتو: نہیں آپ کھڑے ہی رہیں تو بہتر ہوگا۔ آپ کا نام؟

لیکھک: نوین چندر۔

دھوم کیتو: تعلیم؟

لیکھک: ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔

دھوم کیتو: آپ سے کسی مسخرے نے کہا کہ آپ مکالمے لکھا کریں۔

لیکھک: کیوں صاحب مجھ میں کیا نقص نظر آیا ہے آپ کو۔ میں چھ کتابوں کا مصنف ہوں۔ کافی تعلیم یافتہ ہوں۔ میں مکالمے کیوں نہیں لکھ سکتا؟

دھوم کیتو: برخوردار! فلمی مکالمے لکھنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے نہ لیاقت کی۔ اس کے لیے ضرورت ہے لاعلمی اور ناواقفیت کی۔ یعنی جسے ہم دوسرے لفظوں میں فلمی تجربہ کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے آپ تشریف لے جائیں ——

(چپڑاسی سے) دوسرے امیدوار کو بلاؤ۔

چپڑاسی: بہت اچھا سرکار۔

(دوسرا امیدوار داخل ہوتا ہے)

دوسرا امیدوار: نمستے، ڈائرکٹر صاحب۔

دھوم کیتو: نمستے۔ آپ کی تعلیم؟

دوسرا امیدوار: مڈل فیل ہوں۔

دھوم کیتو: بہت خوب۔ تجربہ؟

دوسرا امیدوار: میں نے دس فلموں کے مکالمے لکھے ہیں۔

دھوم کیتو: ان فلموں کے نام بتائیے۔

دوسرا امیدوار: ان فلموں کے نام ہیں "ابابیل"، "لگڑ بگڑ"، "خونی چیتا"، "شمشان"، "قبرستان کا بھوت"، "شریر بندر"، "کالا چور"، "بھورا ہاتھی" وغیرہ وغیرہ۔

دھوم کیتو: اچھا فلم "وغیرہ وغیرہ" کے مکالموں کا ایک نمونہ سنائیے۔

دوسرا امیدوار: ملاحظہ فرمائیے۔ رمیش اس فلم کا ہیرو ہے۔ اور نیلما ہیروئن۔

رتیش نیلما سے کہتا ہے "نیلما۔ نیلما۔ او نیلما۔ جب تم مجھے نظر نہیں آتیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں اندھا ہو گیا ہوں۔ جیسے ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اور سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا ہے۔

دھوم کیتو: کیا کہنے۔ کیا کہنے۔ اور نیلما کیا کہتی ہے؟

دوسرا امیدوار: نیلما کہتی ہے۔ "رتیش اور جو میری حالت ہوتی ہے۔ کاش وہ میں بیان کر سکتی۔ بس یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کہ میں ایکدم پاگل ہو گئی ہوں۔ جیسے میری روح کے ویرانے میں اُلّو بول رہے ہیں چمگادڑیں چکر لگا رہی ہیں اور مرغ اذانیں دے رہے ہیں۔

دھوم کیتو: خوب بہت خوب۔ مرغ اذانیں دے رہے ہیں کا واقعی جواب نہیں۔ بخدا۔ کیا فقرہ لکھ گئے ہیں آپ۔

دوسرا امیدوار: آپ کی عنایت ہے ورنہ میں . . .

دھوم کیتو: آپ یہ کہانی لے جائیے اور اس کے مکالمے لکھوائیے۔

دوسرا امیدوار: معاوضہ کیا ملے گا؟

دھوم کیتو: مکمل مکالمے لکھنے کے آپ کو تین سو روپے ملیں گے۔ اس میں سے سو روپیہ میری کمیشن ہو گی۔ دس روپے پیشگی لے جائیے۔ اور باقی کام ختم ہونے پر۔

دوسرا امیدوار: یہ تو بہت تھوڑا ہے۔

دھوم کیتو: تھوڑا؟ معلوم ہوتا ہے آپ بڑے لالچی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کالم پیان کا لیکا نے مکمل مکالمے میں نے پچاسی روپے میں لکھوائے تھے

اور انیٹ کی بیگم کے صرف پچھتر روپے ہیں۔

دوسرا امیدوار: کچھ بڑھا دیجیے۔

دھوم کیتو: ایک پائی نہیں۔

دوسرا امیدوار: جی۔ غریب آدمی ہوں۔

دھوم کیتو: ارے میاں۔ دنیا میں کون غریب نہیں۔ ہم کون سے لکھ پتی ہیں۔
اچھا منظور ہیں تین سو روپے۔

دوسرا امیدوار: جی — مگر — لیکن۔

دھوم کیتو: لیکن ویکن کچھ نہیں منظور ہیں تو کہئے نہیں تو . . . .

دوسرا امیدوار: جی مجھے منظور ہیں۔

دھوم کیتو: یہ لیجئے کہانی . . .

(چپڑاسی سے) چپڑاسی۔ باقی لکھکوں سے کہہ دو کہ وہ جا سکتے ہیں۔

چپڑاسی: بہت اچھا سرکار۔

پانچواں منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرہ)

شنگار بیگم: میں اندر آ سکتی ہوں۔

دمڑی پرشاد: کون؟ اوہ! ہاں ہاں تشریف لائیے۔

شنگار بیگم: آداب عرض۔

دمڑی پرشاد: آداب عرض۔ آپ کی تعریف؟

شنگار بیگم : میں ہوں شنگار بیگم یعنی کملا یا گملا یا ربیا یا میوہ یا جو کچھ بھی آپ مجھے کہنا چاہیں ۔

دمڑی پرشاد : اوہ ! آپ ہماری فلم کی ہیروئن ہیں ۔

شنگار بیگم : جی ہاں ۔ جی ہاں ۔

دمڑی پرشاد : بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ۔ واقعی آپ شنگار بیگم ہیں بلکہ آپ کو تو شنگار رکبس کہنا چاہیے ۔

شنگار بیگم : شکریہ !

دمڑی پرشاد : آپ کی عمر کیا ہوگی بھلا ؟

شنگار بیگم : پچھلے دس برس سے میری عمر بیس سال چلی آ رہی ہے ۔ ویسے لگتی میں اٹھارہ برس کی ہوں ۔

دمڑی پرشاد : اس میں کیا شک ہے ۔ بلکہ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے ، کہ آپ ابھی دودھ پیتی بچی ہیں ۔

شنگار بیگم : آپ کے علاوہ ڈائرکٹر صاحب کا بھی یہی خیال ہے ۔

دمڑی پرشاد : آپ کیسے تشریف لائیں ؟

شنگار بیگم : آپ کی کشش کھینچ لائی ۔

دمڑی پرشاد : (توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے) ہماری کشش (قہقہہ لگا کر) ہا ! ہا ! ہا ! تو گویا ہم میں بھی کوئی ایسی چیز ہے جو لوگوں کو ہماری طرف کھینچتی ہے ۔

شنگار بیگم : ہاں صاحب اس میں کیا شک ہے ۔

دمڑی پرشاد : اچھا چائے پیجیے گا یا شربت ؟

شنگار بیگم: جی میں صرف سگرٹ پیوں گی۔
دمڑی پرشاد: (بیڑی پیش کرتے ہوئے) لیجئے یہ بیڑی حاضر ہے شوق فرمایئے۔
شنگار بیگم: جی معاف کیجئے۔ میں بیڑی نہیں پیتی۔
دمڑی پرشاد: کوئی بات نہیں۔ آئندہ جب آپ تشریف لائیں گی سگرٹ کا انتظام کر دیا جائے گا۔
شنگار بیگم: شکریہ!
دمڑی پرشاد: اچھا۔ آپ رہنے والی کہاں کی ہیں۔ اور فلم لائن میں کب سے ہیں؟
شنگار بیگم: جی میں لکھنؤ کی رہنے والی ہوں۔ گانا بجانا الہ آباد میں ہی سیکھا۔ ناچنا بمبئی میں۔ کار چلانا کلکتے میں اور تیر اندازی لندن میں۔
دمڑی پرشاد: اوہ۔ تو آپ نے تو گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ کافی تجربہ کار ہیں۔
شنگار بیگم: سب آپ کی عنایت ہے۔
دمڑی پرشاد: اچھا تو پھر ایک آدھ گانا ہو جائے۔
شنگار بیگم: معاف کیجئے اس وقت گانے کا موڈ نہیں۔ پھر کبھی سنا دوں گی۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔
دمڑی پرشاد: اجازت دینے کو تو جی نہیں چاہتا۔ لیکن خیر۔ اب آپ جا سکتی ہیں۔

شنگار بیگم : جانے سے پہلے ایک بات پوچھ سکتی ہوں۔

دمڑی پرشاد : ہاں ہاں بڑے شوق سے۔

شنگار بیگم : کیا میں آپ کو اچھی لگتی ہوں ؟

دمڑی پرشاد : ہاں ہاں کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔

شنگار بیگم : کیا میں خوبصورت ہوں۔

دمڑی پرشاد : کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ کم از کم میری سیٹھانی سے تو زیادہ خوبصورت ہو۔

شنگار بیگم : شکریہ۔ آداب عرض۔

دمڑی پرشاد : آداب عرض۔ کبھی کبھی ضرور ملا کیجئے۔

شنگار بیگم : (مسکرا کر) کبھی کبھی نہیں۔ ہر روز۔

دمڑی پرشاد : (قہقہہ لگا کر) ہاں ہاں۔ یہ ٹھیک ہے۔ ہر روز۔ ہر روز۔

چھٹا منظر

(دھوم کیتو کا دفتر)

(دھوم کیتو کے دائیں طرف گھسیٹا رام یعنی ہیرو اور بائیں طرف شنگار بیگم یعنی ہیروئن بیٹھے ہوئے ہیں۔ میز پر شربت بنفشہ کی بوتل اور تین گلاس رکھے ہوئے ہیں۔ گھسیٹا رام کے بال بڑھے ہوئے ہیں۔ لباس میلا۔ حلیہ عجیب و غریب۔ شنگار بیگم کا لباس بھڑکیلا)

دھوم کیتو: (شربت کا گلاس اٹھاتے ہوئے) شربت بنفشہ زکام کے لئے تو اکسیر ہے۔

شنگار بیگم: ایک دم اکسیر ہے۔ ادھر حلق سے نیچے اترا اور ادھر زکام بالکل غائب۔

گھسیٹا رام: کئی بار تو پنسلین سے بھی تیز ثابت ہوتا ہے۔

دھوم کیتو: آپ شاید نہیں جانتے کہ پنسلین بھی بنفشے کے پھولوں سے تیار کی جاتی ہے۔

گھسیٹا رام: جی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میرے ایک ماموں مویشیوں کے ہسپتال میں چپڑاسی ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنفشے کے پھولوں کے علاوہ دھتورے سے بھی پنسلین تیار کی جارہی ہے۔

شنگار بیگم: (ہنس کر) ہی ہی ہی۔ دھتورے سے۔ دھتورا تو بہت زہریلا ہوتا ہے۔

گھسیٹا رام: پنسلین بھی کم زہریلی نہیں ہوتی۔ میرے ماموں کا کہنا ہے کہ اگر ایک بھینس کو چھ اونس پنسلین پلا دی جائے تو وہ تڑپ تڑپ کر مر جائے گی۔ کیوں ڈائرکٹر صاحب کیا خیال ہے آپ کا۔

دھوم کیتو: ارے بھئی میں ڈائرکٹر ہوں۔ ڈاکٹر نہیں۔ اچھا۔ چھوڑیئے یہ قصہ۔ اب ذرا کام کی باتیں کریں۔ آپ کو معلوم ہے۔ میں نے آپ کو کس لئے بلایا ہے۔

شنگار بیگم: شربت بنفشہ پینے کے لئے۔

دھوم کیتو: بالکل غلط۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ کو کچھ ہدایتیں دینا چاہتا ہوں۔

گھسیٹا رام، شنگار بیگم: فرمایئے۔ فرمایئے۔

دھوم کیتو: (گھسیٹا رام سے) پہلی ہدایت آپ کو دی جاتی ہے کہ آپ اپنا حلیہ ذرا بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ آپ نے بال بری طرح سے بڑھا رکھے ہیں۔ ہمت کر کے آج انہیں ترشوا لیجئے۔ اور ہاں یہ میلی بُش شرٹ بھی بدل لیجئے۔ اگر آپ کے پاس صرف ایک بش شرٹ ہے تو اسے ڈبل ریٹ پر دھلوا لیجئے۔ اور ہاں گھٹیا سگرٹ پینا چھوڑ دیجئے آپ ہماری فلم کے ہیرو ہیں۔ ہیرو کو گھٹیا۔ ۔ ۔ ۔

گھسیٹا رام: جی میں آپ کی ہدایت بالکل سمجھ گیا۔

دھوم کیتو: (شنگار بیگم سے) اور آپ بھڑکیلے کپڑے پہننا چھوڑ دیئے اگر بال بنانے کا ڈھنگ نہیں آتا تو کسی سے سیکھنے کی کوشش کیجئے۔ اور میک اپ کرتے وقت خیال رکھیئے کہ کچھ پاؤڈر ڈبے میں باقی رہ جائے سارا آپ کے چہرے کی نذر نہ ہو جائے سمجھیں آپ۔

شنگار بیگم: جی ہاں۔ بالکل سمجھ گئی۔

دھوم کیتو: اچھا آیئے۔ آج مکالمے کے ایک ٹکڑے کی ریہرسل کر لیں تاکہ سیٹ پر آسانی رہے۔ پہلے میں آپ کو پڑھ کر سناؤں گا۔ اس کے بعد آپ اسے ادا کرنے کی کوشش کیجئے (فائیل سے مکالمہ نکال کر پڑھتا ہے)

"دنیا بہت ظالم ہے پریم۔ یہ دو دلوں کو ملنے نہیں دیتی۔ جب پریمی ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں تو دنیا کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔"

(گھسیٹا رام سے) اچھا اب آپ کہیئے)

گھسیٹا رام: دنیا بڑی جالم ہے شنگار بیگم۔

دھوم کیتو: جالم نہیں، ظالم۔

گھسیٹا رام: جالم۔ جالم۔

دھوم کیتو: ارے بھئی ظالم۔

گھسیٹا رام: ہاں ہاں جالم ہی تو کہہ رہا ہوں۔

دھوم کیتو: عجیب آدمی ہو۔ ظالم نہیں کہہ سکتے ...... اچھا ...... یہ لفظ بدل دیا جائے گا۔ اور ہاں شنگار بیگم مت کہو۔ فلم میں شنگار بیگم کا نام پریم کماری ہے۔ جیسے تمھارا نام گھسیٹا رام نہیں پریم کمار ہے۔ اچھا اب باقی فقرے بولو۔

گھسیٹا رام: یہ دو دلوں کو کبھی ملنے نہیں دیتی۔ جب پریمی ایک دوسرے سے پریم کرتے ہیں تو اس کے سانپوں پر سینے لوٹنے لگتے ہیں۔ ماتھے پر بل پڑ جاتے ہیں اور خون میں آنکھیں اتر جاتی ہیں۔

دھوم کیتو: (غصے سے) نان سنز (NON SENSE) ایک دم نان سنز سب گڑبڑ کر دیا۔ پھر کہو۔ سانپوں پہ سینے نہیں۔ سینے پر سانپ اور خون

میں آنکھیں نہیں۔ آنکھوں میں خون۔ پھر کہو:

گھسیٹا رام: جی میں ذرا تھک گیا ہوں۔ تھوڑا سا شربت بنفشہ پی لوں۔ آپ شنگار بیگم سے ریہرسل کرائیے۔

دھوم کیتو: اچھا پی لو (شنگار بیگم سے) ہاں شنگار بیگم۔ اپنے چہرے پر رنج و غم کے جذبات پیدا کرتے ہوئے کہیئے۔ "یہ سب قسمت کی بات ہے پریم ڈارلنگ! میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ میں گھل گھل کر مر جاؤں۔"

شنگار بیگم: یہ سب پریم کی بات ہے قسمت ڈارلنگ۔

دھوم کیتو: پریم کی بات نہیں قسمت کی بات۔

شنگار بیگم: یہ سب قسمت کی باتیں ہیں گھسیٹا رام۔

دھوم کیتو: گھسیٹا رام نہیں۔ پریم کمار۔

شنگار بیگم: یہ سب پریم کمار کی بات ہے قسمت ڈارلنگ۔

دھوم کیتو: نان سنز۔ ایک دم نان سنز۔ دیکھیے آپ کو یہ فقرے کہتے وقت مسکرانا نہیں چاہیے۔ یہ نہایت ٹریجک سین ہے۔ پھر کہیے۔

شنگار بیگم: یہ سب قسمت کی بات ہے پریم ڈارلنگ۔

دھوم کیتو: شاباش۔ بالکل ٹھیک۔ آگے کہیے۔

شنگار بیگم: آگے تو میں بھول گئی۔ کہوں کیا۔ تمہارا سر۔

دھوم کیتو: نان سنز۔ ڈائرکٹر کو اس طرح سے مخاطب کیا جاتا ہے۔ معافی مانگیے۔

شنگار بیگم: اوہنہ۔ آئے بڑے ڈائرکٹر۔ نہیں مانگتی۔

دھوم کیتو: معافی مانگنی پڑے گی۔ کہئے "مجھے بہت افسوس ہے۔"

شنگار بیگم: نہیں کہتی۔ اگر آپ مجبور کریں گے۔ تو میں آپ سے روٹھ جاؤں گی اور ساری عمر نہیں بولوں گی۔

دھوم کیتو: میں کہتا ہوں۔ ضد نہ کرو شنگار بیگم۔ معافی مانگ لو۔

شنگار بیگم: جائیے۔ نہیں مانگتی۔

دھوم کیتو: اُف سارا چوپٹ ہو گیا۔ بتاؤ گھسیٹا رام۔ جلدی بتاؤ۔ اب میں کیا کروں؟ بڑی ضدی عورت ہے۔

گھسیٹا رام: میں بتاؤں آپ کیا کریں۔

دھوم کیتو: ہاں ہاں کوئی تدبیر بتاؤ۔ یہ تو ایک دم روٹھ گئی۔

گھسیٹا رام: آپ اِس سے معافی مانگ لیجئے۔

دھوم کیتو: میں معافی مانگ لوں . . . ہاں ہاں ٹھیک ہی تو ہے۔ اچھا شنگار ڈارلنگ مجھے معاف کر دو۔

شنگار بیگم: (ہنس کر) اب آئے نہ سیدھی راہ پر۔ بڑا رعب جماتے تھے ڈائرکٹر کہیں کے۔

دھوم کیتو: شکر ہے۔ بشکر ہے۔ تمھارا موڈ تو ٹھیک ہوا۔ اچھا ریہرسل ختم باقی سیٹ پر کریں گے۔

ساتواں منظر

(سیٹھ دمڑی پرشاد کا کمرہ)

(سیٹھ دمڑی پرشاد کچھ فلمی رسالے اور اخبارات پڑھ رہے ہیں۔
دھوم کیتو داخل ہوتا ہے)

دھوم کیتو: آداب عرض۔ سیٹھ صاحب!

دمڑی پرشاد: اوہ۔ ڈائرکٹر صاحب آداب عرض۔ آداب عرض۔ تشریف رکھیے۔ بھئی آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہر فلمی رسالے میں کلاونا نش عرف سنیا ناس کا اشتہار۔ ہر اخبار میں اس کے چرچے۔

دھوم کیتو: آپ کی دعا ہے۔ سب ایڈیٹر اپنے دوست ہیں۔ اور نہ بھی ہوں۔ تو نقد نارائن کی برکت سے بنائے جا سکتے ہیں۔ ایک دفعہ تو ایسی پبلسٹی کی ہے کہ فلم ابھی ختم نہیں ہوئی اور پانچ ڈسٹری بیوٹرز کی آفرز میری جیب میں ہیں۔

دمڑی پرشاد: پانچ ڈسٹری بیوٹرز! پھر تو کام بن گیا۔

دھوم کیتو: دیکھیے سیٹھ صاحب۔ اس وقت پونے پانچ لاکھ خرچ آیا ہے۔ اور پونے بارہ لاکھ کی آفرز آ چکی ہیں۔

دمڑی پرشاد: پونے بارہ مت کہیے ڈائرکٹر صاحب —— یہ تو پو بارہ ہیں۔ پو بارہ۔

دھوم کیتو: سب آپ کی دعا ہے۔ یہ تار ملاحظہ فرمایئے۔ (تار دکھاتا ہے)

نارورن سرکٹ کے لیئے چار لاکھ۔ ایسٹرن سرکٹ کے لیئے چار لاکھ۔
ویسٹرن سرکٹ کے لیئے پونے چار لاکھ۔ ٹوٹل پونے بارہ لاکھ۔

دمڑی پرشاد: (خوشی سے) باپ رے پونے بارہ لاکھ۔ یعنی پورے سات لاکھ کا منافع۔

دھوم کیتو: منہ میٹھا کرایئے سیٹھ صاحب۔ دیکھئے کتنی کامیاب پکچر بنائی ہے۔

دمڑی پرشاد: کرائیں گے ضرور کرائیں گے۔ پہلے فلم ختم تو ہو لینے دیجئے۔ اچھا آخری شاٹ کب لے رہے ہیں؟

دھوم کیتو: اس سوموار کو سیٹ پر ضرور تشریف لایئے گا۔

دمڑی پرشاد: ضرور۔ ضرور۔

دھوم کیتو: اچھا اب اجازت۔ آداب عرض۔

آٹھواں منظر

(سیٹ پر ہیرو اور ہیروئن آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ اور سیٹھ صاحب کرسی پر بیٹھے ہوتے ہیں۔ دھوم کیتو سین ڈائرکٹ کر رہا ہے)

دھوم کیتو: (گھسیٹا رام اور سنگار بیگم سے) یہ آخری شاٹ ہے۔ کافی زوردار ہونا چاہیئے۔ چہرے پر ایسے جذبات ہونے چاہئیں جیسے کہ آپ دونوں کو کھویا ہوا خزانہ مل گیا ہے۔ اور در اصل دوگانے کے بول بھی یہی ہیں۔ ہاں سنگار بیگم ذرا گھسیٹا رام کی طرف مسکرا کر دیکھئے! اور دوگانا شروع کیجئے۔

شنگار بیگم:

مل گیا جی۔ مجھے مل گیا جی۔ مجھے مل گیا جی

میرا کھویا ہوا دیوانہ

گھسیٹا رام:

مل گیا رے۔ مجھے مل گیا رے۔ مجھے مل گیا رے

میرا کھویا ہوا جی خزانہ

شنگار بیگم: آج میرے من کی کوئل کوک اٹھی رے

گھسیٹا رام: آج مجھے ہائے بڑی بھوک لگی رے

شنگار بیگم: آج میری آنکھوں میں خمار سا ہے کیوں

گھسیٹا رام: آج مجھے چڑھ رہا بخار سا ہے کیوں

شنگار بیگم، گھسیٹا رام:

مل گیا رے۔ مجھے مل گیا رے۔ مجھے مل گیا رے

میرا کھویا ہوا جی خزانہ

دھوم کیتو: کٹ (CUT) شاٹ ختم۔

نواں منظر

سیٹھ دمڑی پرشاد کا دفتر

دھوم کیتو، گھسیٹا رام، شنگار بیگم اور باقی ایکٹر حضرات نے "کلاونا ش عرف ستیاناس" میں کام کیا۔ سیٹھ دمڑی پرشاد کے

دائیں بائیں بیٹھے ہوئے ہیں)

دمڑی پرشاد: لیڈیز اینڈ جنٹلمین! یہ چھوٹا سا جلسہ میں نے اس لیے منعقد کیا ہے کہ آپ سب لوگوں کو مبارکباد پیش کی جائے۔ آپ لوگوں کو یہ سن کر بہت خوشی ہو گی کہ "کلاوناش عرف ستیاناس" نے ہر جگہ کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ بمبئی میں چالیس ہفتے۔ دہلی میں تیس ہفتے۔ آگرہ میں بیس ہفتے۔ جالندھر میں پچیس ہفتے اور ناگپور میں بتیس ہفتے۔

سب ایکٹر: (تالیاں پیٹتے ہوئے) مبارک! مبارک! مبارک!

دمڑی پرشاد: میں اس مبارک موقعہ پر کچھ انعامات تقسیم کرنا چاہتا ہوں۔

سب ایکٹر: ارشاد۔ ارشاد۔ ارشاد۔

دمڑی پرشاد: شنگار بیگم کو یہ انعام دیا جاتا ہے کہ آج دوپہر کو میں اس سے شادی کر لوں گا۔ بشرطیکہ ڈائرکٹر صاحب کو کوئی عذر نہ ہو۔

دھوم کیتو: مجھے بالکل کوئی عذر نہیں ہے۔

دمڑی پرشاد: شکریہ! ڈائرکٹر صاحب کو فلم ڈائرکٹ کرنے اور شنگار بیگم کے معاملے میں فراخدلی دکھانے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل پیش کی جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی میری اگلی فلم "سروناش عرف بکواس" کو وہی ڈائرکٹ کریں گے۔

دھوم کیتو: شکریہ۔ بہت بہت شکریہ۔

دمڑی پرشاد: گھسیٹا رام کی خدمات کو سامنے رکھتے ہوئے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انھیں ایک ریشمی بش شرٹ سلوا دی جائے۔ اور باقی ایکٹروں

ARAM GARAM—Kanhaya Lal Kapoor Rs. 1.50

سب کچھ مہنگا ہو گیا — کتابیں سستی ہو گئیں

* تاریخ و سوانح

کتاب	قیمت
ابوبکر صدیق اکبر	۴.۵۰
عمر، فاروق اعظم	۸.۰۰
دس بڑے مسلمان	۴.۰۰
خالد، سیف اللہ	۲.۲۵
المامون	۲.۲۵
الہارون	۲.۲۵
ابوذر غفاری	۲.۰۰
سلطان محمد فاتح	۱.۵۰
الحسین	۱.۵۰
رابعہ بصری	۱.۵۰
امیر معاویہ	۱.۲۵
عمر بن عبدالعزیز	۱.۲۵
امام زین العابدین	۱.۲۵
الزہرا	۱.۰۰
تذکرہ	۳.۰۰
قلوپطرہ	۳.۰۰
روپ متی	۲.۲۵
سلطانی محلوں کے راز	۳.۷۵

* ادب

کتاب	قیمت
میرے بھی صنم خانے	۳.۰۰
غبار خاطر	۳.۰۰
دیوان غالب (فارسی)	۵.۰۰
دیوان غالب (اردو)	۲.۲۵
لذت آوارگی	۳.۰۰
شیر، شیر، شیر (شکار)	۳.۰۰
پتھر کا دیس	زیر طبع
منزل منزل دل بھٹکے گا	"

* عملی نفسیات

کتاب	قیمت
جینے کی اہمیت	۶.۰۰
میٹھے بول میں جادو ہے	۳.۰۰
پریشان ہونا چھوڑئیے	۳.۰۰
گفتگو اور تقریر کا فن	۲.۲۵
جنس کا نفسیاتی پہلو	۳.۰۰
جنس کا جسمانی پہلو	۲.۵۰
زندگی کے موڑ پر	۲.۲۵
شادی اور کامیابی	۲.۲۵
روزمرہ نفسیات	۲.۰۰
نفسیات اور عمل	۲.۰۰
زندگی اور عمل	۱.۵۰
نفسیات کی روشنی	۱.۵۰

* طنز و مزاح

کتاب	قیمت
حماقتیں	۳.۰۰
مزید حماقتیں	۳.۰۰
پرواز	۱.۵۰
لہریں	۱.۵۰
چراغ تلے	۱.۵۰
گرما گرم (لطیفے)	۱.۵۰
ڈھول کا پول (کارٹون)	۱.۰۰
سنگ و خشت	۱.۵۰
شیشہ و تیشہ	۱.۵۰
گرد کارواں	۱.۵۰
چنگ و رباب	۱.۵۰
نرم گرم	۱.۵۰
اردو کا انشائی ادب	(زیر طبع)
حلال و حرام (مذہب)	۲.۲۵

* علم

کتاب	قیمت
معلومات کا انسائیکلوپیڈیا	۳.۰۰

میری لائبریری (ناشران و تاجران) مینار چوک، انارکلی لاہور-۸

رپن پریس لمیٹڈ، لاہور